تحقیقی مقالہ برائے ایم۔ایس۔اُردو

خالدہ حسین کے ناول کاغذی گھاٹ میں ناسٹلجیائی عناصر: تجزیاتی مطالعہ

محقق:

نازش فاروق

195-FLL/MSURDU/F16

نگران:

ڈاکٹر غلام فریدہ

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو

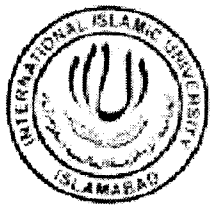

شعبۂ اُردو

بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد

ACCEPTANCE BY THE VIVA VOCE COMMITTEE

Name of the Student: **Nazish Farooq**

Title of the Thesis: خالدہ حسین کے ناول کاغذی گھاٹ مین نا سٹلجیائی عناصر: تجزیاتی مطالعہ

Registration No: 195-**FLL/MSURD/F16**

Accepted by the Department of Urdu, Faculty of Languages & Literature, International Islamic University, Islamabad, in partial fulfillment of the requirements for the Master of Philosophy degree in Urdu.

VIVA VOCE COMMITTEE

Chairperson Viva Committee:

Dr. Humaira Ishfaq
Chairperson Department Of Urdu Female IIUI

External Examiner:

Dr. Saeed Ahmad
Professor
IMCB,F-8/4,Islamabad

Internal Examiner:

Dr. Sabahat Mushtaq
Lecturer
Department Of Urdu, IIUI,
Islamabad

Supervisor:

Dr. Ghulam Farida
Assistant Professor
Department Of Urdu, IIUI,
Islamabad

BK766086

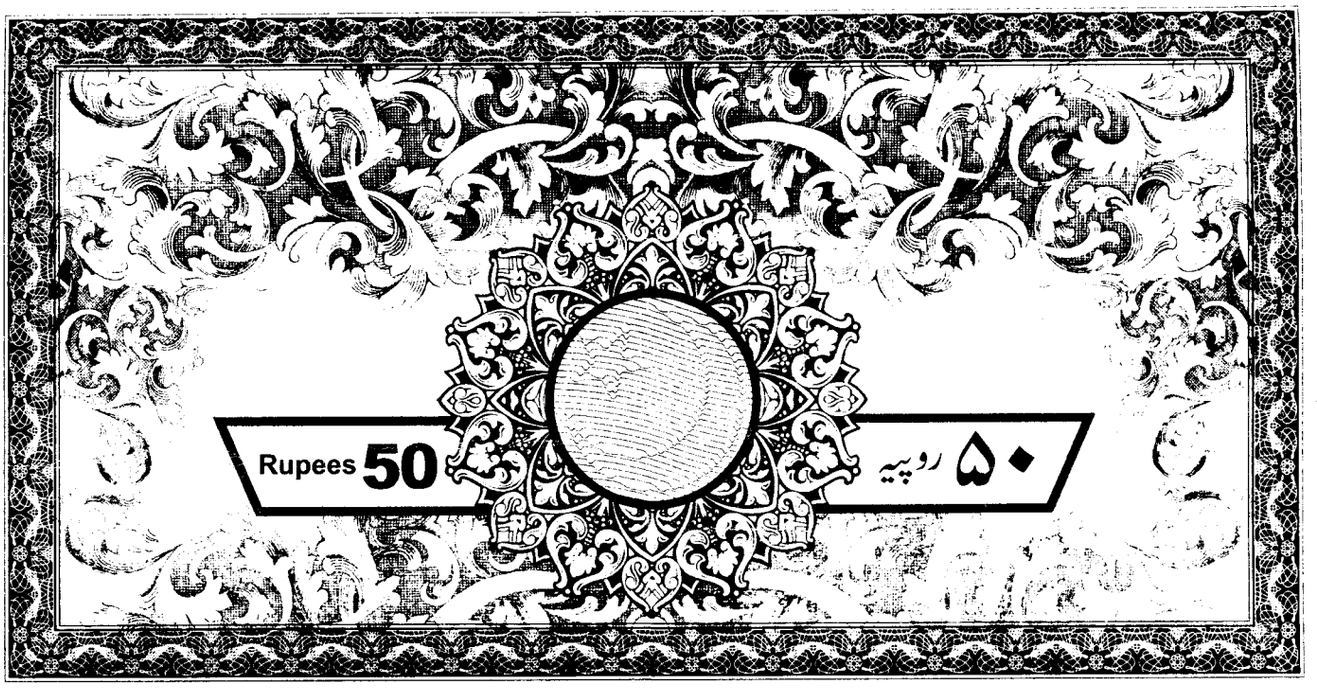

﴿بیان حلفی﴾

منکہ مسماۃ: نازش فاروق زوجہ عبدالصبور رجسٹریشن نمبر 195-FLL/MSURDU/F16 حلفیہ بیان دیتی ہوں:۔

۱۔ یہ کہ من مظہرہ نے اپنے تحقیقی مقالہ بعنوان **" خالدہ حسین کے ناول کاغذی گھاٹ میں ناسٹلجیائی عناصر ایک تجزیہ "** برائے حصول سند ایم فل ڈاکٹر غلام فریدہ کی زیر نگرانی اپنی محنت سے تحریر کیا ہے۔

۲۔ یہ مقالہ سرقے سے پاک ہے اور اس میں تحقیق وتنقید کے اصول وضوابط کو مدنظر رکھا گیا ہے۔

۳۔ لہذا اس سے پہلے یہ کسی جامع میں برائے حصول سند پیش نہیں کیا گیا اس میں شامل تمام حوالہ جات کا استفادہ موجود ہے اور میں اس مقالہ کے تمام نتائج تحقیق کی ذمہ دار ہوں۔

مندرجہ بالا میں جو کچھ لکھا گیا ہے میرے علم کے مطابق بالکل صحیح ودرست ہے اور اس میں کوئی بات پوشیدہ نہیں رکھی گئی

المحلفہ

نازش فاروق زوجہ عبدالصبور

شناختی کارڈ نمبر 37203-8268208-4

گواہ نمبر۱: محمد فاروق ولد امیر محمد خان شناختی کارڈ نمبر 37203-1156087-3 دستخط ونشان انگوٹھا: _____

گواہ نمبر۲: عبدالوہاب ولد محمد فاروق شناختی کارڈ نمبر 37203-5527449-3 دستخط ونشان انگوٹھا: _____

ATTESTED
ADVOCATE HIGH COURT

نمبر 1188
50/-
30/01/2021

نازش فاروق زوجہ عبدالصبور ساکن: نکہ ریحان ڈاکخانہ خاص تحصیل تلہ گنگ ضلع چکوال
شناختی کارڈ نمبر 37203-8268208-4 برائے بیان حلفی

Nazish

AMIR SHAHZAD
Stamp Vender Lic # 791
Churharpal Rawalpindi Cantt

الجامعة الإسلامية العالمية

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

شعبۂ اُردو

تصدیق نامہ

تصدیق کی جاتی ہے کہ نازش فاروق رجسٹریشن نمبر 195-FLL/MSURDU/F16 نے ایم۔ایس۔ اُردو کی ڈگری کی تکمیل کے لیے تحقیقی مقالہ بعنوان **"خالدہ حسین کے ناول کاغذی گھاٹ میں ناسٹلجیائی عناصر: تجزیاتی مطالعہ"** میری نگرانی میں رقم کیا ہے۔ میں تصدیق کرتی ہوں کہ اس موضوع پر اس سے پہلے کہیں کام نہیں ہوا اور یہ کام سرقے سے پاک ہے۔

Islam Hamida

نگران: ڈاکٹر غلام فریدہ

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو

Accession No TH24914

MS
820.95491
ناخ

۱- پاکستانی [illegible]
۲- تاریخی مطالعہ ... پاکستانی ادب

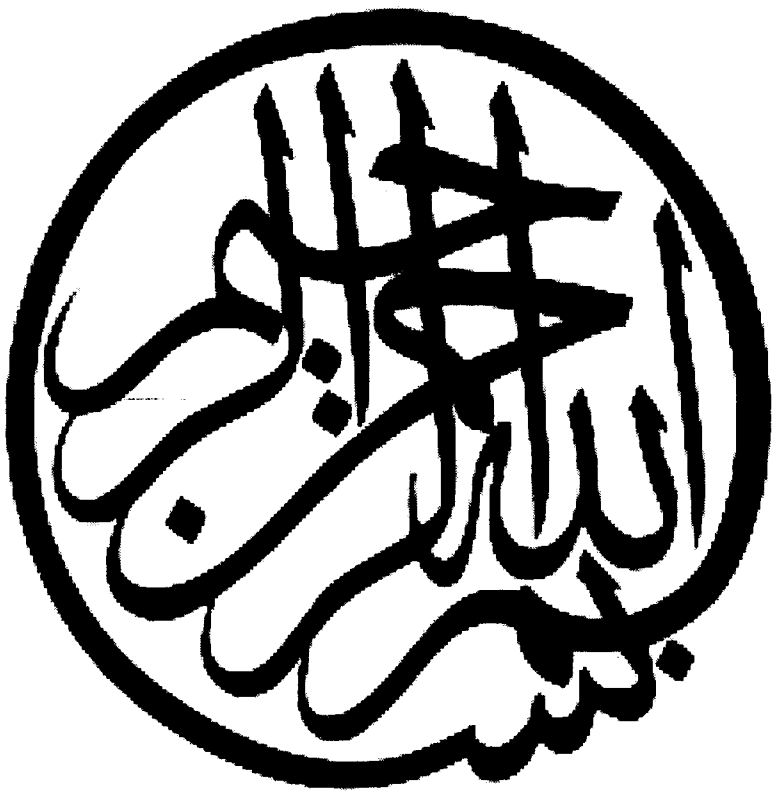

پیش لفظ

سیکھنے اور سوال کرنے کا عمل انسانی فطرت کا حصہ ہے۔ ہر لمحہ کھوجنے اور تلاش کرنے کی یہ خاصیت انسان میں آگے بڑھنے اور زندگی کے بدلتے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے کا حوصلہ پیدا کرتی ہے۔ زندگی کا یہ ارتقائی سفر ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری و ساری رہے گا۔ ایم۔ اے اردو کے بعد ایم ایس اردو کا سفر بھی سیکھنے اور آگے بڑھنے کا ایک نیا باب تھا۔ تحقیق کے اس نئے سفر میں جہاں نئے اساتذہ اور ان کے علمی تجربات سے مستفید ہونے کا موقع ملا وہیں ادبی تناظرات کے نئے اور انوکھے پہلو بھی سمجھنے کو ملے۔ کورس ورک کے دوران ہی عملی تحقیق کا کورس پڑھتے ہوئے جب ہمیں خاکہ تیار کرنے کو کہا گیا تو اس وقت فی الفور کسی موضوع کا ذہن میں آنا انتہائی کٹھن مرحلہ محسوس ہوا۔ ایسے میں اپنے اساتذہ کرام سے مشاورت اور کچھ تحقیقی مقالہ جات کو پڑھنے کے بعد موضوعات کی ایک ناپختہ سی فہرست ذہن میں تشکیل پانے لگی۔ قصہ مختصر بالآخر ڈاکٹر حمیرا اشفاق کے ساتھ موضوع کے مبادیات پر مشاورت کے بعد خالدہ حسین کے ناول کاغذی گھاٹ میں ناسٹلجیائی عناصر کا تجزیاتی مطالعہ تجویز ہوا۔

یہ تحقیقی مقالہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب ناسٹلجیا کا تعارف اور اس کے نظری مباحث ہے جس میں ناسٹلجیا کا تعارف، اس کی اقسام اور مختلف صورتوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ اس کی ادب میں ابتدا اور اس کے ساتھ دوسرے اہم رجحانات جو قیامِ پاکستان کے بعد اردو ادب کی تخلیقات و تصنیفات کا حصہ بنتے رہے، ان کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ باب دوم "اردو کے منتخب ناول نگاروں کے ہاں ناسٹلجیائی عناصر" کے عنوان سے ہے جس میں قیام پاکستان کے بعد ادب کی فکری صورتِ حال کو مدِ نظر رکھتے ہوئے منتخب ناول نگاروں کے ہاں ناسٹلجیا کی پیش کش کا جائزہ لیا گیا ہے۔

باب سوم "خالدہ حسین کے ناول کاغذی گھاٹ کا (وقت کے تقابل، موجودہ صورت حال کی بدحالی) کے تناظر میں مطالعہ" کے عنوان سے ہے۔ اس باب میں کاغذی گھاٹ کو ماضی اور حال کے تہذیبی رویوں اور سیاسی و سماجی صورتِ حال کی تقابلی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔

باب چہارم "خالدہ حسین کے ناول کاغذی گھاٹ کا (شعور و آگہی سے لاعلمی کا دور/پروسٹن ناسٹلجیا) کے تناظر میں مطالعہ" کے عنوان سے ہے۔ اس باب میں ماضی کے دور کی لاعلمی کو موجودہ حال کے تناظر میں تقابلی انداز سے پیش کیا گیا ہے۔ پروسٹن ناسٹلجیا کی ذیل میں ایسے واقعات کو پیش کیا گیا ہے جو ماضی کے کسی خاص واقعے یا یاد سے وابستہ ہوں۔ اس طرح کے واقعات کے بیان سے مصنفہ کی ذہنی کیفیات کو پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ان نفسیاتی عوامل کا بھی جائزہ لیا گیا ہے جو ماضی کی طرف مراجعت کا سبب بنتے ہیں۔

آخری باب ماحصل ہے جس میں موضوع کے تحقیقی سوالات کی روشنی میں حاصلات ور نتائج کو بیان کیا گیا ہے۔

مقالے کی تکمیل کے لیے میں اس ذاتِ باری تعالیٰ کی بے حد شکر گزار ہوں جس نے انتہائی کٹھن لمحات میں بھی مجھے حوصلہ اور آگے بڑھنے کا راستہ دیئے رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ میں آج اس قابل ہوئی ہوں کہ اپنا مقالہ مکمل کر سکوں۔

اپنے اس تحقیقی مقالے کی تیاری اور تکمیل کے سلسلے میں، میں کئی افراد کی مشکور ہوں۔ سب سے پہلے میں اپنی نگران ڈاکٹر غلام فریدہ صاحبہ کی خصوصی طور پر شکر گزار ہوں جنھوں نے شفقت، محبت اور توجہ سے میری رہنمائی فرمائی۔ میں نے جب اور جس وقت ان سے رہنمائی چاہی انھوں نے میری بھرپور مدد کی اور مجھے گاہے بگاہے جامعہ کی مروجہ پالیسیوں سے آگاہ کرتی رہیں۔ میں اپنے آپ کو خوش قسمت مقالہ نگار تصور کرتی ہوں کہ مجھے ان جیسی رہنمائی کرنے والی نگران ملیں۔ انھوں نے مجھے بہترین مشوروں سے نواز اور یوں میرا کام ڈاکٹر صاحبہ کی محنت و کاوش سے آسان ہوتا گیا۔

میں اپنے والدین کے بے حد شکر گزار ہوں جن کی دعاؤں نے مجھے اس مشکل مرحلے کی تکمیل کے قابل بنایا۔ اپنے شریکِ حیات کی جتنی بھی تعریف کروں کم ہے جنھوں نے گھریلو ذمہ داریوں کے ساتھ بچوں کو بھی سنبھالا اور مقالے کی کمپوزنگ کے ساتھ ساتھ کتابوں کی فراہمی کا کٹھن مرحلہ بھی ان ہی کی بدولت پایۂ تکمیل کو پہنچا۔

میں یونیورسٹی کے اساتذہ خصوصاً شعبۂ اُردو کے تمام فیکلٹی ممبران کی بھی مشکور ہوں جن سے مجھے ورکشاپ اور کورس ورک کے دوران میں کافی کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔

آخر میں اپنے سسرال والوں کی جنھوں نے مجھے گھریلو ذمہ داریوں سے فراغت بخشی اور مجھے اپنا مقالہ مکمل کرنے کا مشورہ دیا اور یوں سب کی مشترکہ کاوش سے میرا یہ کام مکمل ہوا۔

نازش فاروق

جنوری ۲۰۲۱ء

فہرست موضوعات

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
	پیش لفظ	
۱۔	**باب اوّل:**	
	ناسٹلجیا کا تعارف اور اس کے نظری مباحث	۱
۱۔	ناسٹلجیا کیا ہے؟	۱
۲۔	ناسٹلجیا کے مختلف معنی اور تعریفیں	۲
۳۔	ناسٹلجیا کی مختلف صورتیں	۳
	i۔ ماضی کی طرف لوٹنے کا عمل	۳
	ii۔ گھر سے دوری اور وطن واپسی کی خواہش	۳
	iii۔ تسلسل کی آرزو	۴
	iv۔ بے یقینی، لاتعلقی اور بے جڑ ہونے کا احساس	۴
	v۔ نفسیاتی بیماری	۵
۴۔	قیام پاکستان کے بعد ادبی صورت حال	۱۰
۵۔	ہئیت، اسالیب اور رجحانات	۱۱
۶۔	تقسیم ہند کے بعد اردو ناول کے مختلف رجحانات	۱۲
	i۔ تہذیبی رجحان	۱۳
	ii۔ حقیقت پسندانہ رجحان	۱۴
	iii۔ تاریخی و اسلامی رجحان	۱۴
	iv۔ نفسیاتی و جنسی رجحان	۱۵
	v۔ دستاویزی رجحان	۱۵
	vi۔ رومانوی و عشقیہ رجحان	۱۵

vii۔ سوانحی رجحان ۱۶
viii۔ سیاسی رجحان ۱۶
ix۔ ناسٹلجیائی رجحان ۱۷
حوالہ جات ۲۱

۲۔ باب دوم:

اردو کے منتخب نمایاں ناول نگاروں کے ہاں ناسٹلجیائی عناصر ۲۳
ناسٹلجیا کے اسباب ۲۳
۱۔ عصری صورت حال کی تلخی ۲۳
۲۔ ہجرت کا کرب ۲۵
۳۔ مسرت و سکون کی تلاش ۲۷
۴۔ تشخص کی تلاش ۲۸
۵۔ قیام پاکستان کے بعد سیاسی حالات ۲۹
۶۔ نمایاں ناول ۳۰
i۔ آگ کا دریا ۳۳
ii- اداس نسلیں ۳۴
iii- ایسی بلندی ایسی پستی ۳۸
iv- بستی ۴۲
حوالہ جات ۴۶

۳۔ باب سوم:

خالدہ حسین کے ناول کاغذی گھاٹ میں (وقت کا تقابل، موجودہ صورت حال کی بدحالی) کے تناظر میں مطالعہ ۴۸
۱۔ وقت کا تقابل ۴۸
۲۔ موجودہ صورت حال کی بدحالی ۴۸
حوالہ جات ۷۰

۴۔ **باب چہارم:**

خالدہ حسین کے ناول کاغذی گھاٹ میں (شعور و آگہی سے لاعلمی کا دور، پروسٹن ناسٹلجیا)
کے تناظر میں مطالعہ ۷۲

۱۔ شعور و آگہی سے لاعلمی۔ناسٹلجیا کا دور ۷۲

۲۔ پروسٹن ناسٹلجیا ۷۲

حوالہ جات ۹۵

۵۔ **باب پنجم:**

ماحصل ۹۷

کتابیات ۱۰۴

باب اوّل:

ناسٹلجیا کا تعارف اور اُس کے نظری مباحث

ناسٹلجیا:

ناسٹلجیا دو یونانی الفاظ Nostos بمعنی "واپسی" اور Algos بمعنی "درد" سے مل کر بنا ہے۔ ناسٹلجیا کو عام طور پر ماضی کے شدید احساس سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ماضی میں ناسٹلجیا کو ایک بیماری قرار دیا جاتا رہا ہے کیونکہ ماضی میں گھر سے دور رہنے والے سپاہی وطن یا گھر واپس جانے کی شدید خواہش کے نتیجے میں دل شکستگی اور اداسی کا شکار ہو جایا کرتے تھے۔ گذرتے پل اور جڑوں سے کٹ جانے کا نتیجہ ناسٹلجیا کی صورت میں رونما ہوا۔

ناسٹلجیا کا لفظ پہلی مرتبہ (جونس ہافر)Johaness Hofer نے وطن کی خواہش یا گھر کی یاد، گھر سے دوری کے احساس وغیرہ کے طور پر متعارف کروایا۔ ناسٹلجیا کی مختلف صورتیں بیان کی گئی ہیں، جس میں وطن واپسی کی خواہش، یاد ماضی، گھر سے دوری کا احساس، ماضی کی حسرت ناک یادیں، تسلسل کی آرزو، داخلی خود کلامی، خود کو دہرانے کی خواہش، ماضی کی یاد دلانے والی اشیاء وغیرہ ہیں۔

ناسٹلجیا ایک نفسیاتی رجحان ہے۔ ناسٹلجیا کو ماضی میں جس طرح ایک بیماری یا نفسیاتی عارضہ تصور کیا جاتا تھا، موجودہ دور میں اس نظریے کو بدل دیا گیا ہے یعنی بیماری کی بجائے اسے خوشگوار یادوں اور خوبصورت لمحوں کا استعارہ قرار دیا گیا ہے۔ قاضی جاوید اس تصور کو کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

> بہت سے دوسرے خیالات اور احساسات کی طرح ناسٹلجیا کا احساس بھی ہماری سماجی زندگی کو متاثر کرتا ہے وہ ہمیں ماضی کے لمحوں اور مقامات میں سے ایسے اجزاء تلاش کرنے پر آمادہ کرتا ہے جو ہماری موجودہ صورت حال کا مداوا کر سکیں۔[1]

"یاد" ایک ایسی اصطلاح، ایک ایسا استعارہ ہے جسے انفرادی شخصیت کی بنیاد تصور کیا جاتا ہے۔ یاد ماضی سے منسلک ہے اور یاداشت ہی سے ماضی نے جنم لیا ہے کیونکہ یاد نہ ہو تو ماضی کا وجود بھی نہیں رہتا۔ یاد ماضی کا خوبصورت استعارہ ہے جو بہت سے خیالات اور احساسات کو جنم دیتا ہے اور اپنی ذات کے بکھرے ہوئے اجزاء کی ترکیب بندی کر کے شیرازہ بندی کرتا ہے۔ ماضی کوئی گمشدہ یا بے مصرف شے نہیں ہے بلکہ حال و مستقبل کے روشن امکانات کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے گویا ماضی، حال و مستقبل تینوں اجزاء ایک ہی سلسلے سے وابستہ ہیں۔ بقول انتظار حسین:

> حافظہ نہ ہو تو ماضی کا عرفان کیا اور ماضی کا عرفان نہ ہو تو حال و مستقبل کی حد بندی کیا۔ یہ عمل ظاہر ہے محض ایک غیر محدود ہے۔ نام و نشان سے حال میں زیست کرنے سے جاری ہو سکتا ہے۔ بد قسمتی کہہ

لیجئے کہ ترقی پسند تحریک کے ذریعے اردو ادب میں سماجی حقیقت پسندی کی بے جا مداخلت کے سبب اردو کا افسانوی ادب اگست ۱۹۴۷ء تک ایسا ادب رہا ہے جو خود اپنی روایت سے باغی اور گریزاں ہے۔[۲]

ناسٹلجیا کے مختلف معنی اور تعریفیں:

آکسفورڈ انگلش اردو ڈکشنری میں ناسٹلجیا سے مراد:

ماضی کی حسرت ناک یادیں، ماضی کی یاد دلانے والی اشیاء، گھر کی یاد، گھر سے دوسری کا احساس۔[۳]

پریکٹیکل ڈکشنری میں ناسٹلجیا کے معنی ہیں:

گھر سے دوری، گھر کا ہڑکا، وطن کی یاد۔[۴]

ویبسٹر ڈکشنری میں ناسٹلجیا کا معنی:

A longing to go back to ones home, home town or homeland, homesickness, a longing for something for away or long.[۵]

آکسفورڈ انسائیکلوپیڈیا ڈکشنری میں ناسٹلجیا کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

Severe homesickness, sorrowful longing for conditions of a past age, regretful or wistful memory of earlier time.[۶]

آکسفورڈ انگلش ڈکشنری میں ناسٹلجیا کے معنی:

A feeling of pleasure and also slight sadness when you think about things that happened in the past.[۷]

ناقدین اور مفکرین نے ناسٹلجیا پر مختلف تبصرے کیے ہیں محمد م عاصم بٹ بطور مصنف ناسٹلجیا کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ناسٹلجیا خود کو دہرانے کی خواہش کا نام ہے۔ ناسٹلجیا سے مراد اپنے ماضی کی طرف لوٹنے کا عمل ہے۔ ماضی سے مراد وہ سب کچھ جو ہو چکا ہے اور وہ سب کچھ جو پہلے تھا، اس کی طرف لوٹنے کی خواہش ناسٹلجیا ہے۔[۸]

عاصم بٹ کے اس اقتباس کو مد نظر رکھتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ناسٹلجیا کی صورت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب ماضی کی یاد اپنی شدت اختیار کر لے، اپنی مٹی اور زمین سے دوری کی کیفیت سے دوچار انسان کو یہ احساس

ناسٹلجیا کی کیفیت میں مبتلا کر دیتا ہے۔ ماضی کی یادوں سے جڑا انسان اپنے حال سے زیادہ خوش نہیں ہوتا بلکہ ماضی کی طرف لوٹنے کی خواہش ہر پل اُس کے دل میں مچلتی رہتی ہے۔

ناسٹلجیا سے مراد پس کربیہ بھی لیا جاتا ہے جو ہمارا ماضی ہے مگر پس کربیہ کی لفظی تشریح ناکافی ہے کیونکہ پس کربیہ میں دکھ اور درد و غم ہی نہیں بلکہ فرحت اور مسرت کے جذبات بھی شامل ہوتے ہیں۔

ناسٹلجیا کی مختلف صورتیں:

ا۔ ماضی کی طرف لوٹنے کا عمل:

ناسٹلجیا ماضی کی یادوں کا خوبصورت استعارہ ہے۔ گذرے ہوئے زمانے کی یاد ہے۔ گذرتا ہوا لمحہ، لمحۂ موجود سے منقطع نہیں ہوتا بلکہ انسان کے وجود پر ماضی کی پرچھائیاں پڑتی رہتی ہیں۔ کسی بھی معاشرے کی تصویر اس وقت تک مکمل نہیں ہوتی جب تک ماضی کے کٹے ہوئے حصے اس کے ساتھ مل نہیں جاتے۔ اسی طرح انسانی شخصیت بھی اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک کہ ماضی کے کٹے ہوئے حصے کو تخیل کی مدد سے واپس لا کر ذات میں سمویا جائے۔ گویا افراد کا تشخص ان کے ماضی میں چھپا ہوتا ہے ہر گزرتا لمحہ ماضی میں بدل جاتا ہے۔ انسان حال میں جی رہا ہوتا ہے اور اس کے ساتھ اس کی جڑیں ماضی میں پیوست ہوتی ہیں۔ یاد ماضی کے انسان کی زندگی پر گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد اُردو ادب کو دیکھا جائے تو ناسٹلجیا کسی نہ کسی صورت میں ہمیں ضرور ملتا ہے۔ اُردو ادب کی کوئی بھی صنف ہو اس پر طبع آزمائی کرنے والوں کے ہاں ناسٹلجیائی عناصر جابجا بکھرے نظر آتے ہیں۔ کوئی بھی ادیب یا شاعر اپنے ارد گرد کے ماحول اور جغرافیائی حدود کا مشاہدہ ایک عام آدمی کی نسبت باریک بینی سے کرتا ہے اور معاشرے کی حقیقتوں کو اپنی تحریروں کا حصہ بنا کر پیش کرتا ہے۔

۲۔ گھر سے دوری اور وطن واپسی کی خواہش:

ناسٹلجیا کی ایک صورت گھر سے دوری کا احساس ہے جو اپنی مٹی اور سرزمین سے دور ہونے کے سبب پیدا ہوتی ہے۔ وطن سے دور بسنے والے سپاہی اپنے گھروں کو لوٹنے کی شدید خواہش دل میں سمائے رہتے ہیں ان کو ماضی کی طرف لوٹنے کا احساس کرب میں مبتلا رکھتا ہے اور وہ دل شکستگی اور اُداسی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ گزرتا ہر لمحہ اور جڑوں سے کٹ جانے کا نتیجہ ناسٹلجیا کی صورت میں سامنے آتا ہے۔

۳۔ تسلسل کی آرزو:

ناسٹلجیا کا شکار فرد تسلسل کی آرزو کرتا ہے اسے ہر لمحہ ماضی کے گزرے لمحے یاد آتے ہیں۔ ناسٹلجیا میں مبتلا شخص کی خواہش ہوتی ہے کہ وقت کا تسلسل نہ ٹوٹے، ماضی حال ہی رہے اور حال کبھی ماضی میں نہ بدل جائے۔

بقول خالدہ حسین:

> ایک Era یعنی عہد ہوتا ہے اور دوسرا Aura یعنی مہک، میں ایک خاص عہد کی خوشبو کو مقید کرنا چاہتی تھی اس لیے میں نے ناول لکھ دیا۔[۹]

ناسٹلجیا ایک ایسی جذباتی وابستگی ہے۔ ناسٹلجیا میں مبتلا ہر فرد کو گزرا ہوا لمحہ شدت سے یاد آتا ہے جسے وہ یاد کرتے ہوئے مسرت اور سکون حاصل کرتا ہے۔ بنیادی وجہ یہ ہے کہ انسان کبھی بھی اپنے ماضی کو فراموش نہیں کر سکتا اور اگر اسے وسیع تناظر میں دیکھیں تو اس کی اصل وجہ یہ بھی ہے کہ ہم سب اپنے مرکز سے کٹے ہوئے ہیں جس کے سبب مستقل بے چینی اور اضطراب ناسٹلجیا کا سبب بنتا ہے۔

بے یقینی، لاتعلقی اور بے جڑ ہونے کا احساس:

تقسیم کے بعد پاکستان میں منتقل ہونے والی آبادی کا ۹۵ فیصد ملک کے مغربی حصے اور ۵ فیصد آبادی ملک کے مشرقی حصے میں منتقل ہوا۔ پورے پاکستان میں مختلف زبانوں اور ثقافتوں کا ملاپ ہوا۔ یوں پاکستان کی مجموعی ثقافت میں تحرک پیدا ہوا اور یہی تحرک مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا سبب بن گیا۔ مشرقی پاکستان میں صوبوں کی خود مختاری کا مطالبہ مختلف سیاسی، اقتصادی، سماجی، معاشرتی اور ثقافتی وجوہات کی بناء پر علیحدگی پسندی کی تحریک بن گیا اس کی ابتداء بنگالی زبان کی تحریک سے ہوئی تھی۔ جس نے قائداعظم کی اس تقریر کے فوراً بعد ہی جنم لیا تھا جو انہوں نے مارچ ۱۹۴۸ء کو ڈھاکہ میں کرتے ہوئے اعلان کیا تھا کہ پاکستان کی سرکاری زبان اردو ہو گی۔

۱۹۵۶ء میں بنگال کو اردو کے ساتھ پاکستان کی سرکاری زبان تسلیم کر لیا گیا مگر اکتوبر ۱۹۵۷ء میں جنرل ایوب خان نے ۱۹۵۶ء کا متفقہ دستور منسوخ کر کے ملک میں مارشل لاء نافذ کر دیا۔ مشرقی پاکستان کا مغربی پاکستان سے اعتبار اُٹھ گیا۔

۱۹۵۶ء کی جنگ کے دوران مشرقی پاکستان بالکل کٹ کر رہ گیا تھا اس لیے وہاں یہ یقین بھی عام ہو گیا کہ مغربی پاکستان کی فوج اس کے حصے کا دفاع نہیں کر سکتی۔ جنوری ۱۹۴۴ء میں عوامی لیگ کی تحریک کے چھ نکات سامنے آئے جو آخر کار دسمبر ۱۹۷۱ء میں بنگلہ دیش کے قیام کا سبب بنے۔ چنانچہ ایک بار پھر لوگوں کو انہی حالات سے گزرنا پڑتا ہے جن میں سے وہ ۱۹۴۷ء میں گزرے تھے ایک بار پھر انہیں ہجرت کا دکھ سہنا پڑا۔

یہی وجہ ہے کہ اُردو ادب میں قیام پاکستان کے بعد شناخت کا سوال اور پھر بحران پیدا ہوا۔ پوری قوم اس سوال کی زد میں تھی کہ ہماری جڑیں کہاں ہیں؟ من حیثیت قوم ہماری منزل کہاں ہے؟ لیکن ابتداء ہی میں ان سوالوں کے جواب متعین کرنے کی بجائے سیاسی عدم استحکام، معاشی بدحالی اور آمریت کا جبر ہم پر مسلط رہا۔ ترجیحات کی تبدیلی اور اقتدار کی پامالی کے باعث رفتہ رفتہ پورا تہذیبی نظام ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گیا۔ اس کے باعث اُردو ناول میں ناسٹلجیائی رجحان ابھر کر سامنے آیا۔ چونکہ محرومی، بے چہرگی، بنجرپن، نارسائی اور عدم تشخص کا گھمبیر مسئلہ ایسے سنگین مسائل ہیں جو کہ مسلسل اس عہد میں موجود تھے اور آج بھی ہمارے معاشرے میں موجود ہیں۔

نفسیاتی بیماری:

ادب اور نفسیات کے ایک دوسرے پر نہایت گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں، دونوں کا تعلق انسانی ذہن سے ہے۔ نفسیات کے حوالے سے **فرائیڈ** کا نظریہ "تحلیل نفسی" موجودہ دور کا حیرت انگیز انکشاف ہے۔

فرائیڈ کی یہ عطا ہے کہ اس نے انسانی ذہن کے پوشیدہ گوشوں تک رسائی حاصل کی اور ایک نظام دریافت کیا جس کا تعلق تحت الشعور سے تھا۔ فرائیڈ نے لاشعور کی دبی ہوئی خواہشات کو تحلیل نفسی سے دریافت کرنے کی کوشش کی اور یوں وہموں کو شعوری سطح پر ادراک عطا کر دیا۔ اہم بات یہ ہے کہ ان خواہشات سے ارتفاع Sublimation بھی حاصل ہوتا ہے اور یہ کسی ایسے مقصد میں معاون بن جاتی ہیں جس سے معاشرے میں عظمت و رفعت حاصل ہوتی ہے۔

فرائید کا بنیادی نظریہ جنسی قوت یا LIBIDO پر مبنی ہے۔ اِڈ id نفس قوت کا سرچشمہ ہے۔ اسے معروضی حیثیت کا علم تک نہیں ہوتا۔ یہ انسانی تجربے کے بارے میں صرف یہ جانتا ہے کہ وہ درد بخشتا ہے یا لذت۔ اِڈ کے دائرے کے اندر آپ کو EGO اور سپر ایگو (Super Ego) ایک دوسرے سے جڑے ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایگو ذہن کے اندر اشیاء کو خارجی دنیا کی اشیاء سے ممیز کرتا ہے۔ تجربے کے بارے میں ایگو صرف یہ پوچھتا ہے کہ وہ سچ ہے یا جھوٹ۔ ایگو جبلی ضروریات اور خارجی ماحول میں گویا رابطہ قائم کرتا ہے۔ سپر ایگو معاشرے کے اقتدار کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہ گویا شخصیت کا اخلاقی پہلو ہے اور تجربے کے بارے میں یہ دریافت کرتا ہے کہ وہ اچھا ہے یا بُرا۔

نفسیات کی اصطلاح میں ناسٹلجیا ایک ایسی بیماری ہے جس میں گھر سے دوری اور خود کو ایک نئے ماحول میں ڈھالنے کی کوشش اور اُسے قبول کرنا شامل ہے۔ جسے فرد کبھی بھی خوشی سے قبول نہیں کرتا یعنی ناسٹلجیا اس کیفیت کا نام ہے جس میں غریب الوطنی کے کرب اور نئے ماحول میں خود کو ڈھالنے کی کوشش پر ناکامی کا احساس جب انسان کو بے بسی کے دوراہے پر لا کھڑا کرتا ہے تو اس وقت کے معمولات میں یاد تمنائی میں مبتلا شخص، ہر لمحہ، ہر ساعت اپنے گھر

کے افراد، گزرے وقت میں درپیش حالات وواقعات کا تذکرہ کرتا رہتا ہے۔ عام طور پر اس کا مفہوم یہ بنتا ہے کہ وطن سے جدائی کی شدت جب انتہائی حدوں کو چھونے لگے تو فرد ناسٹلجیا کا شکار ہو جاتا ہے۔ وہ واپس اپنی جڑ کی طرف جانا چاہتا ہے۔ وہ خود کو اس نئے ماحول میں اجنبی محسوس کرتا ہے اور رجعت پسندی کا شکار ہو جاتا ہے ان تمام عوامل کے باعث ناسٹلجیا ایک منفی رویہ بن کر سامنے آتا ہے۔ لیکن ادبی نقطہ نظر سے یہ ایک مثبت پہلو رکھتا ہے جس میں ماضی کی تخلیقی بازیافت ہے جو تخلیق کار کی کاوشوں سے معاشرے کی از سر نو تعمیر کی شدید خواہش بن کر ابھرتا ہے اور پس منظر میں انفرادی برتری، حسب ونسب کی شناخت اور خاندان ونسل کو قابل فخر بنانے کی شعوری کوشش بھی ہے۔

عمومی سطح پر دیکھا جائے تو ناسٹلجیا دراصل ایک ایسی مثبت توانائی کا نام ہے جو گزرے ہوئے دور کے اشخاص اور جگہوں سے وابستہ ہو جاتی ہے۔ اکثر ہمیں کچھ جگہیں پسند نہیں آتیں لیکن وہاں پر گزرا ہوا وقت یاد آتا ہے۔ یقیناً یہ اس گزرے ہوئے وقت سے وابستہ توانائی اور تعلق ہوتا ہے جو ہمیں بار بار اس دور کی یاد لاتا ہے۔

ناسٹلجیا کی ایک صورت خود اختیار کردہ ہجرت کے نتیجے میں سامنے آتی ہے۔ چونکہ ہمارے معاشرے میں مسائل میں پیچیدگی مسلسل چلی آرہی ہے لہذا لوگوں کے یہاں اپنے ماحول سے غیرت، بیگانگی اور ناسٹلجیا پیش درپیش چلا آرہا ہے۔ نظام جبر، جمہوری قدروں کی پامالی اور غربت وبے روزگاری کی وجہ سے عموماً لوگ یورپی ممالک کی طرف سفر کرتے ہیں۔ اپنے اپنے خاندان کے لیے زر مبادلہ کمانے کی فکر میں تمام زندگی وطن سے دور گزارتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے ہاں ناسٹلجیا جنم لیتا ہے۔

اُردو ناول کے ممتاز محقق ممتاز حسین اس حالت کو کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

> گھر کو لوٹ جانے کی شدید خواہش ناسٹلجیا ہے۔[۱۰]

ناسٹلجیا یونانی زبان کا لفظ ہے جس کا مطلب ہے گھر جانے کی دردناک خواہش۔ اسے ہم ماضی کے شدید احساس سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ ناسٹلجیا ماضی میں ان سپاہیوں کی وطن واپس جانے کی خواہش کے حوالے سے ایک بیماری تصور کی جاتی تھی جو دل شکستگی اور اداسی کا شکار ہو جایا کرتے تھے۔ لیکن اب اسے عام طور پر ماضی کی خوشگوار یادوں کے اشعار کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ ماضی کی لمحہ موجود میں دریافت کرنے کو ناسٹلجیا کہتے ہیں۔ علم نفسیات میں یہ اصطلاح نفسیاتی، ذہنی امراض میں مبتلا مریضوں کا علاج کرنے کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ یہ ایک ایسا مرض ہوتا ہے جس میں مریض اپنے ماضی کی کربناک یادوں میں مبتلا ہو کر حال میں بھی ماضی کو تلاش کرتا ہے۔

ناسٹلجیا ماضی کی خوشگوار یادوں کا نام ہے۔ ایسی یادیں جن سے حال میں مسرور ہوا جائے۔ دیکھا جائے تو ناسٹلجیا حال کی گزشتہ تاریخ ہے جو ماضی کی منتشر کہانیوں کو واضح اور مضبوط کر کے لمحہ موجود میں زندہ کرتا ہے۔ یعنی

ناسٹلجیا ماضی اور حال کے درمیان داخلی مکالمہ ہے اور اس مکالمے کا نتیجہ ماضی سے محبت ہے، حال کی ناآسودگی سے تنگ آکر ماضی کی طرف سفر کرنے کی خواہش جب شدت اختیار کر جائے اور انسان ماضی کی خوشگوار یا ناخوشگوار یادوں میں وقت گزارنے میں راحت محسوس کرے تو اس کیفیت کو ناسٹلجیا کا نام دیا جاتا ہے۔

انسان اپنے ماضی سے جڑا ہوا ہے اور اپنے حال کو ماضی کے آئینے میں دیکھتا ہے۔ ماضی کے احساسات خوشگوار ہوں یا ناخوشگوار، ان سے دامن چھڑانا ممکن نہیں ہوتا اور بعض انسان تو جیتے ہی ماضی میں ہیں اور سچ یہ ہے کہ ماضی انسان کی زندگی میں حال کو بتانے کا ایک ایسا عمل ہے جس کی بدولت حال کا سفر آسان اور مستقبل کی امیدیں قوی ہو جاتی ہیں۔ ہر فرد اپنی زندگی میں سوچے سمجھے بغیر بہت سی کیفیات اور احساسات کو جذباتی طور پر محسوس کرتا ہے اچھی یا بُری ہر دو کا تعلق ماضی یا حال سے ہوتا ہے۔

اصطلاحی طور پر اس کا مطلب ماضی پرستی کی ایک ایسی شدید خواہش ہے کہ جس کو فراموش کیا جانا ناممکن ہے جو اپنا تاثر قائم رکھے اور جذبات و احساسات میں ظاہر ہو۔ مختلف لغات میں ناسٹلجیا کی وضاحت یوں بیان کی گئی ہے۔

Nostalgia is like a grammer lesson you find the present tense, but the past perfect owns fee memory

یعنی ناسٹلجیا گرامر کے اس سبق کی طرح ہے جس میں آپ کو ماضی مکمل کی صورت میں حال مطلق میں ہوتے ہیں۔[11]

ناسٹلجیا ماضی میں وقوع پذیر ہونے والی خوشگوار اور ناخوشگوار یادوں کا نام ہے۔ پس کہا جا سکتا ہے کہ ناسٹلجیا حسین یادوں کا وہ خوشگوار احساس ہے جو انسانی ذہن کے دریچوں میں خوشی اور شادمانی کے ان مسرت بخش لمحات کو جنم دیتا ہے جن سے وہ بھرپور لطف اٹھاتا ہے۔

ویبسٹر ڈاٹ کام ڈکشنری "ناسٹلجیا" کی تفہیم اس انداز میں کرتی ہے۔

Pleasure and sadness that is casual by remembering something from the past and wishing that your could experience it again.

ناسٹلجیا راحت اور غم کا وہ منفرد احساس ہے جس کی تذکیر اور اس سے دوبارہ گزرنے کی خواہش پر کبھی خزاں نہیں آتی۔[12]

جبکہ Allencaintlky ڈاٹ کام میں ناسٹلجیا کو پرانی بیماری کا نام دیا گیا ہے۔

Nostalgia: A wistful desire to return in thought or in fact to a former time ones family and friend; a

sentimental yearning for the happiness of a former place or time, a nostalgia for his college days.[۱۳]

یعنی ماضی پرستی دراصل ماضی کی طرف لوٹ جانے والے کسی فرد کی وہ خواہش ہے جو گھر، وطن، خاندان یا دوستوں کی جدائی میں نمو پذیر ہوتی ہے۔ جو وقت اور لمحے اس نے ماضی میں خاندان، دوستوں اور مسکن میں گزارے ہیں کی طرف واپس پلٹ جانے کی اُمنگ۔ مثال کے طور پر کالج یا تعلیمی ادارے میں بیتے ایام کی یاد آوری کو ناسٹلجیا کہا جاتا ہے۔

Hollandہولینڈ کے مطابق ناسٹلجیا:

ہولینڈ ناسٹلجیا کو سحر انگیز چیز خیال کرتا ہے جو انسان کو عصر حاضر کی تلخیوں سے باخبر کرتا ہے جبکہ اس کو حقیقت سے بلند کوئی صورت بتاتا ہے۔

ایک اور مغربی ادیب لیش Lashناسٹلجیا کو دائمی آگ کا شعلہ قرار دیتے ہیں جو اپنے دھیمے انداز میں تسلسل کے ساتھ سلگ رہا ہے۔ جس کی تپش اور اذیت نظر نہ آتے ہوئے بھی بندے کو بھسم کر جاتی ہے۔ اس حوالے سے وہ کہتے ہیں:

A persistent law-level but omnipresent irritant that can not be cured.[۱۴]

یہ ایک عمومی بحث ہے کہ انسانی یادیں اور خیالات گذشتہ اطلاعات و معلومات میں اضافے کا باعث بنتی رہی ہیں جو حدود و قیود سے ماوراہو کر کسی بھی حد تک پرواز کر سکتی ہیں اور لامتناعی سمتوں کو چھو سکتی ہیں۔ لوئنتھل Lawenthalسائیکالوجی کی اس لغت کی وضاحت اپنے انداز میں کرتے ہوئے اس کو نارسائی کی وہ حد قرار دیتا ہے جس کے سامنے انسان بے بس بھی ہے اور اس کی حقیقت سے باخبر بھی۔

پس ناسٹلجیا ایک ایسا انسانی فطری رویہ ہے جس میں ماضی کی تصویر حال میں نظر آتی ہے اور جس میں ماضی کو شدت کے ساتھ محسوس کیا جاتا ہے۔ ہر کردار ماضی کی طرف پلٹنا چاہتا ہے تاکہ حال کی ناآسودگی کو ماضی کی خوبصورت یادوں کے سہارے سکھ، چین اور آرام میں بدلا جا سکے۔

قیام پاکستان کے عمل نے برصغیر کے مسلمانوں کو نہ صرف ایک سمت اور حال و مستقبل کا پتہ دیا بلکہ ماضی کو کھوجنے، اپنے احساسات کا حصہ بنانے اور سمجھنے کی خواہش بھی دی، چنانچہ ادب میں پہلی بار قوم پرستی، حب الوطنی اور معاشرتی اصلاح کے موضوعات آئے اور اس کے ساتھ ساتھ ایک بالکل انوکھا موضوع یا رجحان بھی جس کو ناسٹلجیا کہا جاتا ہے۔ اس رجحان کی بنیاد ہجرت کے تجربے پر تھی۔ ہجرت کے بعد یہ احساس شدت سے ان کے ادباء کے ہاں

(خاص طور پر یہ جو ہجرت کر کے آئے تھے) کے ہاں در آیا، جن کی ذات کا کوئی حصہ کٹ کر ماضی میں رہ گیا تھا۔ موجودہ معاشرے کی کوئی تصویر اس وقت تک پوری نہیں ہو سکتی جب تک کہ ماضی کے کٹے ہوئے حصے کو تخیل کی مدد سے واپس ذات میں لا کر سمونہ دیا جائے۔ چنانچہ آدمی حال میں تو سانس لیتا ہے لیکن اس کی جڑیں ماضی میں پھیلی ہوتی ہیں۔ اس ماضی پرستی کے حوالے سے بہت سے ناقدین نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

اردو ادب کے ممتاز مزاح نگار مشتاق احمد یوسفی (جن کے کئی کردار ناسٹلجیا کے عناصر لیے ہوتے ہیں) اس کیفیت کو خود یوسفی صاحب کبھی یادش بخیر یا کبھی ماضی گیراں، کبھی یاد تمنائی کا نام دیتے ہیں۔ اس کو لمحہ منجمد کی داستان اور ضوں گری قرار دیتا ہے۔ ماضی کی بھول بھلیوں میں گم مستقبل کے خوف میں مبتلا اور حال کی بدحالی سے ڈرنے والے ان کرداروں کی کیفیت کو یوسفی ایک خوبصورت مثال سے سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ماضی گیراں (بروزن ماہی گیراں) ماضی کو پکڑ کر بیٹھ جانے والے لوگ تمنائی پاشاں طرازی کے پس منظر میں مجروح انا کا طاؤس رقص ریدنی ہوتا ہے مور فقط اپنا ناچ ہی نہیں، اپنا جنگل بھی خود پیدا کرتا ہے۔ ناچتے ناچتے ایک طلسماتی لمحہ ایسا آتا ہے کہ سارا جنگل ناچنے لگتا ہے اور مور کھڑا خاموش دیکھتا رہ جاتا ہے۔ ناسٹلجیا اس لمحہ منجمد کی داستان ہے۔[۱۵]

اس مجموعے (آب گم) کے بیشتر کردار ماضی پرست، ماضی زدہ اور مردم گزیدہ ہیں ان کا اصل مرض ناسٹلجیا ہے۔ جب انسان کو ماضی حال سے زیادہ پر کشش نظر آنے لگے اور مستقبل نظر آنا بند ہو جائے تو باور کرانا چاہیئے کہ وہ بوڑھا ہو گیا ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ بڑھاپے کا جان لیوا حملہ کسی بھی عمر میں بالخصوص بھری جوانی میں ہو سکتا ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو ایشیائی ڈرامے کا اصل ولن ماضی ہے۔ داستان طرازی کے پس منظر میں مجروح انا کا طاؤس رقص دیدنی ہوتا ہے۔

ممتاز احمد خان ناسٹلجیا کے متعلق بیان کرتے ہیں:

> ناسٹلجیا ایک مثبت طرز احساس ہے۔۔۔۔ ناسٹلجیائی یادیں کبھی جدا نہیں ہو سکتیں کیوں کہ یہ فطرت انسانی کا خاصہ ہیں۔۔۔ یہ سوال کہ یہ مریضانہ اور منفی جذبہ ہے تو نہیں، تو اس کا صاف جواب یہ ہے کہ ایسا قطعی نہیں۔[۱۶]

ناسٹلجیا ایک ایسا وقوعہ، تجربہ اور مؤثر جذبہ ہے جو ماضی کے کسی خاص دور سے منسلک جذبات اور اس خاص دور کی طرف خواہش کا رویہ ہے اسے محض سحر انگیز ماضی کی یاد نہیں کہا جا سکتا بلکہ اس سے دوچار ہوانے والا شخص ماضی کے اس خاص تجربے کو اپنے موجودہ حال میں دوبارہ جیتا ہے جس کے سبب ماضی کی خوشگوار جھلکیاں حالیہ تجربے کی تلخی کو کم کر دیتی ہیں۔ پس ناسٹلجیا ایک ایسا انسانی فطری رویہ ہے جس میں ماضی کی تصویر حال میں نظر آتی ہے اور

جس میں ماضی کو شدت سے محسوس کیا جاتا ہے تاکہ حال کی ناآسودگی کو ماضی کی خوبصورت یادوں کے سہارے سکھ، چین اور آرام سے بدلا جا سکے۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے پہلے اُردو ادب میں قصے کہانیاں اور داستانیں عام تھیں۔ لیکن ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اس اعتبار سے اہمیت رکھتی ہے کہ اس نے صرف سیاسی انقلاب ہی برپا نہیں کیا بلکہ سماجی اور اخلاقی قدروں کے معیار میں بھی تبدیلی آئی جس سے ادب بھی متاثر ہوا۔ جنگ آزادی نے یہ بھی بات ہم پر واضح کر دی کہ ہماری سب سے بڑی کمزوری زندگی سے دوری ہے۔ اس شعور کے آتے ہی زندگی کے ہر شعبے میں اصلاحات کی ابتداء ہو گئی۔ اس اعتبار سے اردو فکشن کی تاریخ میں انیسویں صدی سیاسی و تہذیبی کروٹوں کی صدی ہے۔ یہ دور برصغیر کی ادبی و فکری تاریخ کے لیے غیر معمولی دور تھا۔ یورپ سے آنے والی نئی تہذیب، نئی تعلیم کی اہمیت، پرانی تعلیم کی فرسودگی، عیسائی مذہب سے مناظرے وغیرہ ایک ٹکراؤ کی صورت میں نظر آتے ہیں۔ جس میں مٹتی ہوئی پرانی روایت کے ساتھ تہذیبی بقاء کی کوشش نظر آتی ہے۔ اس دور کے نمائندہ ناول نگاروں میں ڈپٹی نذیر احمد، سرشار اور عبدالحلیم شرر شامل ہیں۔ ان ناول نگاروں کے ہاں تہذیبی تصادم نظر آتا ہے۔ مرزا ہادی رسوا بھی انہی کے پیروکاروں میں شامل ہیں۔ ڈپٹی نذیر ایک طرف طبقہ نسواں کی اصلاح کرتے نظر آتے ہیں اور دوسری طرف ابن الوقتی کا درس دیتے ہیں۔

پریم چند کی ناول نگاری فنی و فکری اعتبار سے گذشتہ ادیبوں کے ناولوں سے چند قدم آگے ہے۔ ان کی بڑی خصوصیت مقامی رنگ اور فطرت انسانی کا باریک بینی سے مشاہدہ ہے۔

اُردو میں جدید ناول کے خدوخال بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں ابھرتے ہیں۔ اس دور میں اُردو ناول اپنے مزاج کے اعتبار سے زندگی اور انسانوں کے مسائل سے قریب ہو گیا۔ اس صدی میں بہت حصہ ترقی پسند تحریک کا بھی ہے۔ جس کے تحت ناول کا اسلوب، کہانی کے نئے طرز بیان، نفسیات اور سماجی الجھنوں، وقت، انسانی زندگی اور اس کے عمل دخل کا نئے ڈھنگ کے ساتھ احاطہ کرتا ہے۔ ناول محض اصلاحِ مذاق اور مثالیت پسندی سے نکل کر عملی اور حقیقی زندگی کی طرف متوجہ ہوتا ہے، جس کی نمایاں جھلک پریم چند کے ہاں نمودار ہوتی ہے۔ عصمت چغتائی، کرشن چندر اور عزیز احمد اس دور کے نمائندہ ادیب ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد ادبی صورتحال:

آزادی سے قبل فنکاروں میں کرشن چندر، عزیز احمد، عصمت چغتائی، ڈاکٹر احسن فاروقی ہنوز لکھ رہے تھے۔ بعد میں اس قافلے میں دیگر قابل ذکر فن کار مثلاً قرۃ العین حیدر، شوکت صدیقی، نثار عزیز بٹ، خدیجہ مستور وغیرہ بھی شامل ہو گئے۔ کرشن چندر جنہوں نے شکست ۱۹۲۳ء سے ناول نگاری کا آغاز کیا تھا اور جو سوشلزم کے

حوالے سے نظریاتی ناول تھا۔ خم ٹھونک کر اس میں آ گئے۔ عزیز احمد جو آزادی سے قبل "ہوس" ۱۹۳۳ء مرمر اور خون ۱۹۳۴ء، "گریز" ۱۹۴۲ء، "آگ" ۱۹۴۶ء لکھ چکے تھے۔ آزادی کے وقت ایسی بلندی ایسی پستی ۱۹۲۸ء کے ساتھ منظر عام پر آئے۔ لیکن "شبنم" ۱۹۴۱ء کی تخلیق کے بعد ان کی ناول نگاری کا سفر تمام ہو گیا۔ عصمت چغتائی نے ۱۹۴۰ء میں "ضدی" اور ۱۹۴۵ء میں "ٹیڑھی لکیر" لکھے تھے۔ ڈاکٹر احسن فاروقی کا "شام اودھ" اور "رہ ورسم آشنائی" لکھے تاہم ان کی پہچان "شام اودھ" ہی رہا۔ قرۃ العین حیدر کا ناول "میرے بھی صنم خانے" خاص اہمیت رکھتا ہے۔

یہ وہ فن کار تھے جو آزادی کے وقت ناول نگاری کے حوالے سے سامنے آئے۔ کچھ ادیب ترقی پسند تحریک کا حصہ بن گئے لیکن احسن فاروقی اور قرۃ العین حیدر اس سے کوسوں دور رہے۔ کچھ عرصہ تک ترقی پسند تحریک کا راج رہا لیکن بعد میں اس میں دراڑیں پڑنا شروع ہو گئیں۔ اس سلسلے میں معروف نقاد، محقق ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی رائے ہے:

> ترقی پسند تحریک نے اُردو ناول کو بعض نئے رجحانات سے آشنا کرایا۔ [۱۷]

ہیت، اسالیب اور رجحانات:

۱۹۸۰ء کے آغاز اور بعد کا ناول ہیت، اسالیب اور رجحانات کے اعتبار سے پاکستان میں ناول کو نئے ذائقوں سے روشناس کراتا ہے۔ انتظار حسین کے ناول بستی کا ماضی کی یادوں یا ناسٹلجیا کے حوالے سے بہت چرچا تھا۔ اس دہائی میں ناول کی تخلیق کی رفتار میں خاصی بہتری آئی۔ حجاب امتیاز علی نے پراسرار رومانی فضاء کو پیش کیا۔ ۱۹۸۰ء میں ان کا ناول "پاگل خانہ" منظر عام پر آیا۔ اس کے ساتھ ہی دو اور ناول ظہور میں آئے۔ ان میں سے ایک انیس ناگی کا "دیوار کے پیچھے" اور دوسرا نثار عزیز بٹ کا "کاروانِ وجود" ہے اس کے بعد ۱۹۸۱ء میں انور سجاد کا ناول "خوشیوں کا باغ"، بانو قدسیہ کا "راجہ گدھ"، رحیم گل کا "جنگ کی تلاش"، غلام ثقلین نقوی کا "میرا گاؤں"، غلام عباس کا "گوندنی والا تکیہ"، خدیجہ مستور کا "زمین"، جمیلہ ہاشمی کا "چہرہ بہ چہرہ روبرو" اور "تلاش بہاراں"، فہیم اعظم کا "جنم کنڈلی"، طارق محمود کا "اللہ میگھ دے"، سلمیٰ اعوان کا "تنہا" منظر عام پر آئے۔ ۱۹۸۰ء سے ۱۹۸۹ تک پاکستان کے ناولوں میں موضوعاتی تنوع نظر آتا ہے۔

بیسویں صدی کے آخر میں ناول کی تخلیقی رفتار تو وہی رہی لیکن اس کا اتنا چرچا نہیں ہوا۔ تاہم اکیسویں صدی کے آغاز میں مستنصر حسین تارڑ کا ناول "قربت مرگ میں محبت"، ۲۰۰۱ء میں منظر عام پر آیا۔ ۲۰۰۲ء میں اگلا ناول

"قلعہ جنگی" اور خالدہ حسین کا کاغذی گھاٹ شائع ہوئے۔ مرزا اطہر بیگ کا ناول "غلام باغ" اور ۲۰۰۷ء میں محمد حمید شاہد کا "مٹی آدم کھاتی ہے" منظر عام پر آیا۔

تقسیم ہند کے واقعے نے ادب پر اپنے دور رس اثرات مرتب کیے۔ تقسیم کے وقت ہونے والے فسادات اور جبری منتقلی ایسے سانحے تھے جنہوں نے براہ راست فرد کی ذات کو متاثر کیا۔ ایک شدید ذہنی کشمکش، صدمے اور کرب سے دوچار کیا اور ان گنت انسانوں کو ان کی تہذیب اور ان کی زمینوں سے اکھاڑ کر اجنبی اور غیر مانوس تہذیب کی طرف دھکیل دیا۔ اس حوالے سے رشید امجد کا کہنا ہے:

> ۱۹۴۷ء میں برصغیر دو علیحدہ علیحدہ مملکتوں میں تقسیم ہو گیا، لیکن اس کے ساتھ ہی ایک بڑا انسانی المیہ بھی وجود میں آتا ہے۔ اتنی بڑی سطح پر انسانی خون کی ارزانی اور انسانی وقار کی بے حرمتی نے علیحدہ مملکت کی خوشی کو ایک بڑے دکھ اور سوگ میں بدل دیا۔[۱۸]

تقسیم ہند کے حوالے سے اردو ادب میں بیش بہا اضافے ہوئے خاص طور پر فکشن میں اضافے ہوئے۔ فکشن میں بھی ناول اور افسانے میں عصری صورتحال کی تلخی نے ان لکھنے والوں کے ہاں ناسٹلجیا کو جنم دیا۔ تقسیم سے قبل انسان مذہب کی تقسیم کے بغیر ایک سرزمین پر بستے تھے۔ اُن کے دکھ سکھ مشترک تھے لیکن تقسیم کے ساتھ ہی لوگ ایک دوسرے کے مخالف ہوئے، خوشیاں چھن گئیں، دکھوں میں وسعت آگئی۔ انسانیت نے دم توڑا، ایک دوسرے کی جان، مال، عزت، آبرو لٹ گئی۔ انسانیت بے لباس ہو کر ایسے سامنے آگئی کہ آنکھیں بند کر لینے کے باوجود بھی اس کا مکروہ چہرہ آنکھوں کے سامنے سے نہ ہٹ سکا۔

قیام پاکستان کے بعد اُردو ناول کا اگر جائزہ لیا جائے تو تقسیم اور اس کے نتیجے میں ہونے والی نقل مکانی، اس کے منفی اثرات، اپنی زمینوں سے اکھڑ جانے کا غم، نئی زمینوں میں آبادکاری کا مسئلہ، اجنبیت کا احساس، محرومی کا احساس اور شکستہ خوابوں کی کرچیاں ہمیں جابجا بکھری ملتی ہیں۔ عرصہ دراز گزر جانے کے باوجود لوگ ماضی میں بسیرا کیے ہوئے ہیں۔ یہی چیزیں ان کے ہاں ناسٹلجیا کا باعث بنی ہوئی ہیں۔

تقسیم ہند کے بعد اُردو ناول کے مختلف رجحانات:

قیام پاکستان کے بعد اُردو ادب میں بہت سے رجحانات پیدا ہوئے۔ کئی انقلاب آئے یوں ان رجحانات اور انقلابات نے ناول میں بھی جگہ بنائی۔ رجحان کا مطلب رواج، فیشن، میلان یا کوئی خاص رُخ ہے۔ رجحان کیلئے انگریزی زبان میں ٹرینڈ Trend کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ رجحان کی تعریف ڈاکٹر ممتاز احمد خان ان الفاظ میں کرتے ہیں:

ادب میں رجحان ایک ایسے رُخ یا میلان کی جانب اشارہ ہے جو کسی ایک خاص قسم کے موضوع سے تعلق رکھتا ہو یعنی یہ ایک خاص ذہنی رویہ ہے۔[19]

ادب چونکہ انسانی زندگیوں کی عکاسی کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ جب وقت بدلتا ہے تو مختلف رویے، جذبے، افکار اور رجحانات اپنی شکل اختیار کر لیتے ہیں نئے خیالات اور نئے نئے نظریات پروان چڑھنے لگتے ہیں۔ جیسے جیسے حالات بدلتے ہیں کوئی خاص رویہ پنپنے لگتا ہے اور اسی کے تحت ادیبوں اور شاعروں کی ایک بڑی تعداد اس پر اظہار خیال کرنے لگتی ہے۔ مثلاً آزادی سے پہلے ایک اہم موضوع جیسے ادب کا حصہ بنایا جاتا تھا وہ اصلاحِ معاشرہ تھا۔ چنانچہ اس دور میں اصلاحی ناول لکھے جاتے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد تو بہت سے موضوعات اور رجحانات نے جنم لیا اور حقیقت پسندی کو فروغ حاصل ہوا۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی رجحان کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

ادب میں نئے رجحانات بدلتے ہوئے حالات اور ان کے نتیجے میں نئے نئے خیالات اور نظریات کے زیر اثر پیدا ہوتے ہیں جب معیاروں میں تبدیلی ہوتی، اقدار نئی صورتیں اختیار کرتی ہیں تو ادب بھی ان سے متاثر ہوتا ہے۔[20]

قیام پاکستان کے بعد جو ناول لکھے گئے ہیں ان میں حقیقت پسندانہ رجحان ملتا ہے۔ اس سے قبل بھی ادیبوں کے ہاں حقیقت نگاری موجود تھی تاہم قیام پاکستان کے بعد اسے مزید فروغ ملا۔ اس کے علاوہ بھی مختلف رجحان سامنے آتے ہیں ان میں سے چند ایک یہ ہیں۔

تہذیبی رجحان:

برصغیر میں ایک وقت ایسا تھا جب اخلاقی روایات اور اقدار کو خاص اہمیت دی جاتی تھی۔ آپس میں اتفاق، اتحا، محبت اور خلوص کا رواج عام تھا۔ مہمان نوازی، بھائی چارہ، ہمدردی جیسے جذبے عروج پر تھے۔ اس کے بعد ایک وقت ایسا بھی آیا جب یہ تمام جذبے زوال کا شکار ہونے لگے۔ چنانچہ ادب میں بھی عروج وزوال کی ان تبدیلیوں کو محسوس کیا گیا۔ یوں جو رجحانات پیدا ہوئے ان میں ایک تہذیبی رجحان ہے۔ اس سلسلے میں خاص نام عزیز احمد کا ہے اسی طرح کئی اور ادیبوں میں قرۃ العین حیدر کا ناول "گردش رنگِ چمن"، جیلانی بانو کا "ایوانِ غزل"، ڈاکٹر احسن فاروقی کا "شام اودھ" اور مستنصر حسین تارڑ کا "بہاؤ" شامل ہیں۔ اس کے علاوہ شوکت صدیقی کا خدا کی بستی، خدیجہ مستور کا آنگن، عبداللہ حسین کا اداس نسلیں، انتظار حسین کا بستی اور بانو قدسیہ کا راجہ گدھ قابل ذکر ہیں۔

حقیقت پسندانہ رجحان:

آزادی کے وقت پاکستان اور ہندوستان دونوں ملکوں میں حقیقت پسندانہ رجحان کے تحت ہی ناول لکھے جارہے تھے۔ حقیقت پسندانہ رجحان نے انفرادی اور سماجی حقیقتوں کو گہری نظر سے جانچنے اور فنکار کی ذاتی محسوسات اور انسانی ضرورتوں کو باہم مربوط کرنے کا رویہ اختیار کیا۔ حقیقت پسندانہ رجحان کے تحت لکھے جانے والے نمائندہ ناولوں میں فضل کریم فضلی کا ناول "خون جگر ہونے تک"، سید شبیر حسین کا ناول "جھوک سیال"، عبیداللہ حسین کا ناول "باگھ"، انیس ناگی کا "محاصرہ" اور "کیمپ"، محمد عاصم بٹ کا ناول "دائرہ"، آمنہ مفتی کا ناول "جرات رندانہ"، محمد حمید شاہد کا ناول "مٹی آدم کھاتی ہے" اور مرزا اطہر بیگ کا "غلام باغ" وغیرہ شامل ہیں۔

تاریخی واسلامی رجحان:

قیام پاکستان کے بعد کئی بڑے شاہکار ناول لکھے گئے۔ ناول نگاری کو ترقی پسند تحریک سے نقصان پہنچا تھا کیونکہ اس دور میں افسانے لکھے جارہے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد ناول نگاری کا از سر نو ادباء میں رجحان پیدا ہوا اور بے شمار تاریخی واسلامی ناول لکھے گئے۔ ان ناولوں میں ہیجانی کیفیت کو موضوع بنایا گیا، رقت آمیز جذبات کو زیر بحث لایا گیا اور فسادات کے رد عمل کے طور پر ادب تخلیق کیا گیا۔ قیام پاکستان کے بعد جو ناول لکھے گئے ان میں ماضی کی عظمت رفتہ کے گن گائے گئے جو قاری کو بہت پیچھے اسلاف کے کارناموں کے دھندلکوں میں لے گئے۔ یہ ناول سطحی جذباتیت اور ہیجان کی تسکین کیلئے تو ٹھیک تھے لیکن ادبی اور فنی اعتبار سے ان کا مقام کچھ بلند نہ تھا۔

فسادات نے ادباء کو ذہنی طور پر متاثر کیا اور ادباء نے ٹھنڈے دل سے فسادات کا تجزیہ کر کے ادب تخلیق کیا۔ قرۃ العین نے جب اپنا ناول "آگ کا دریا" تخلیق کیا تو چاروں طرف اودھم مچ گئی کیونکہ انھوں نے اپنے تاریخی شعور سے کام لے کر استعماری طاقتوں کو نشانہ ملامت بنایا۔ اسی ناول کے اجراء پہ قرۃ العین حیدر کو ملک بدری جیسی سزا سے دوچار ہونا پڑا۔ نسیم حجازی نے اپنے تاریخی ناول "خاک اور خون" میں تقسیم ہند کے غم ناک حادثے کو بڑی ہی پر سوزی سے بیان کیا یہ ناول لکھ کر انہوں نے ظلم و بربریت کا منہ نوچا ہے۔ عبداللہ حسین کا ناول اُداس نسلیں تاریخی اتار چڑھاؤ کو بیان کرتا ہے۔ نثار عزیز بٹ کے ناولوں نے بعض تاریخی کوتاہیوں کو چھپالیا۔ نثار عزیز بٹ کے تین مشہور ناولوں میں "نگری نگری پھر مسافر" نے چراغ نے گلے "کارواں وجود"۔ ان تینوں ناولوں میں قیام پاکستان کے لیے کی گئی جدوجہد کا ذکر ہے۔

اس کے علاوہ بھی تاریخی واسلامی رجحان کے تحت لکھے جانے والے ناولوں میں ڈاکٹر احسن فاروقی کا ناول

"سنگم"، جمیلہ ہاشمی کا ناول "تلاش بہاراں" اور "دشت سوس"، بانو قدسیہ کا ناول "راجہ گدھ"، اختر حامد خان کا ناول "گنگا جمنا میدان" اور ممتاز مفتی کا ناول "علی پور کا ایلی" اہم ہیں۔

نفسیاتی و جنسی رجحان:

نفسیات اور ادب کا گہرا تعلق ہے۔ انسانی نفسیات کا بیان سب سے پہلے مرزا ہادی رسوا نے انجام دیا۔ ان کے ناول "امراؤ جان ادا" میں محض طوائف امراؤ جان ہی کی نفسیات کا بیان نہیں بلکہ ان تمام افراد کا جائزہ بھی اس میں موجود ہے جو اس کے حوالے سے سامنے آتے ہیں۔ منشی پریم چند نے بھی اس روایت کو نبھایا۔ عصمت چغتائی کے ناولوں میں یہ رجحان واضح نظر آتا ہے۔ اس حوالے سے ان کا ناول "ٹیڑھی لکیر" بہت اہم ہے۔ مکمل نفسیاتی و جنسی رجحان خواہ کسی ناول نگار کے یہاں مشکل نہ ہو لیکن اس کی جھلکیاں ضرور نظر آتی ہیں۔ جنسی نفسیات کا اظہار کوئی آسان کام نہیں اس کا کریڈٹ عصمت چغتائی کو دیا جاتا ہے کہ انہوں نے سستی جذباتیت، رومانیت، جنس نگاری، رومانیت جیسے منفی عناصر کے باوجود خصوصاً ٹیڑھی لکیر کو ادبی لحاظ سے ڈوبنے نہیں دیا۔

ممتاز مفتی کا علی پور کا ایلی نفسیاتی و جنسی رجحان کا حامل ناول ہے۔ اس کے علاوہ عزیز احمد کا ناول شبنم، گریز اور ایسی بلندی ایسی پستی، شموئل احمد کا ندی، اکرام اللہ کا گرگ شب اور بانو قدسیہ کا راجہ گدھ وغیرہ شامل ہیں۔

دستاویزی رجحان:

دستاویزی رجحان کو بھی ناول کا حصہ بنایا گیا ہے دستاویزی رجحان مصنف سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ مخصوص علمی معلومات کے حصول کے لیے کتب اور دستاویزات کا مطالعہ کرے اور اس سے اخذ کردہ نکات یا معلومات کو فکشن میں استعمال کرے۔ اس سلسلے میں حیات اللہ انصاری کا پانچ جلدوں پر مشتمل ناول "لہو کے پھول" ایک مثالی حیثیت رکھتا ہے جس میں انہوں نے ہندوستان کی تحریک آزادی اور دوسرے سیاسی سماجی و معاشرتی پس منظروں کا نچوڑ پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ رشیدہ رضویہ کے تین ناولوں، جمیلہ ہاشمی کے "دشتِ سوس" اور احسن فاروقی کے "سنگم" میں بھی تاریخی دستاویزات موجود ہیں۔ تاہم قرۃ العین حیدر اور شوکت صدیقی وغیرہ کے ہاں دستاویزی رجحان زیادہ کامیابی سے منسوب ہے۔

رومانی و عشقیہ رجحان:

خالص عشقیہ و رومانی رجحان کے حامل ناول کبھی سنجیدہ ناول کا مقابلہ نہیں کر سکتے اسی لیے ان میں موضوعات، تکنیک اور مواد بلکہ اسلوب کا بھی تنوع نہیں ہوتا۔

نیاز فتح پوری اور مجنوں گورکھپوری دونوں ہمارے ادب کے ناقابل فراموش کردار ہیں لیکن دونوں کی اہمیت ان کے رومانی و عشقیہ ناولوں کی وجہ سے نہیں ہے۔ دونوں ادیب تنقید کے میدان میں بڑا درجہ رکھتے ہیں۔ احسان اکبر اپنی کتاب "پاکستانی ناول ہئیت اور رجحان از پاکستانی ادب" میں پاکستان میں ناول کے ارتقاء کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> اس دوران میں ایک اور سطح پر ناول تخلیق ہوتا رہا۔ یہ سطح معاشرتی رومانس سے لے کر سماجی حقیقت نگاری تک پھیلی ہوئی ہے اس ناول نویسی کے اندر بہت سے رویے جمع ہیں مگر ان کی مجموعی پہچان ایک نہیں بنتی۔ ۱۹۵۰ء کے بعد جس طرح شاعری میں مغربی تجربات اور غیر ملکی ادبی لہریں در آئیں تھیں ۔اس طرح اس عہد کے ناول کا مجموعی رویہ صرف لکھنے کے مقصد تک رہ جاتا ہے۔ ان میں عمدہ اور کامیاب ناول بھی ہیں جنہوں نے جدید تعلیم یافتہ سوسائٹی یا معاشرے کے اونچے طبقے کے رومانس میں دلچسپی لی۔ [۲۲]

سوانحی رجحان:

سوانحی رجحان پر مبنی ناول لکھنا اتنا آسان نہیں تھا جتنا بظاہر نظر آتا ہے اس راہ میں ذاتی زندگی کے واقعات آڑے آتے ہیں تاہم دو ادیبوں کے نام جو اس حوالے سے خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ وہ ممتاز مفتی اور ڈاکٹر احسن فاروقی ہیں۔ جنہوں نے یہ پل صراط بخوبی پار کیا۔ "علی پور کا ایلی" جسے ہم نفسیاتی و جنسی رجحان میں زیر بحث لاتے ہیں دراصل سوانحی رجحان کا عکاس نظر آتا ہے۔ اس میں "ایلی" خود ممتاز مفتی ہیں اور حمد علی یعنی ایلی کے باپ کو انہوں نے متعدد انٹرویوز میں اپنے باپ کا چربہ کہا ہے ان کے اپنے الفاظ پیش خدمت ہیں، وہ اسے اپنی آپ بیتی کہتے ہیں۔

سیاسی رجحان:

سیاست انسانی زندگیوں سے الگ نہیں دونوں کے روابط باہم مربوط ہیں اردو فکشن میں اس کا اظہار خاص طور پر پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے بعد ہوا جب جان و مال کی بڑی تباہی دیکھنے میں آئی۔

برصغیر میں آزادی کی تڑپ نے سیاسی صورتحال پیدا کی جس کو ناول نگاروں نے اپنے ناول کا موضوع بنایا۔ اس رجحان کے تحت حیات اللہ انصاری کا ناول "لہو کے پھول" (جو کہ پانچ جلدوں پر مشتمل ہے) بہت اہم ہے دیگر ناولوں میں رشیدہ رضویہ کے ناول "لڑکی ایک دل کے ویرانے میں" عبداللہ حسین کا اداس نسلیں اور "باگھ"، سلمیٰ اعوان کا ناول "تنہا"، جیلانی بانو کا ناول "بارش سنگ"، فضل احمد کریم فضلی کا ناول "خون جگر ہونے تک"، رضیہ فصیح احمد کا ناول "صدیوں کی زنجیر" اور طارق محمود کا ناول "اللہ میگھ دے" وغیرہ اہم ہیں۔

ناسٹلجیائی رجحان:

ناول میں جہاں مختلف رجحانات نے جگہ پائی وہاں ایک اہم رجحان "ناسٹلجیا" ہے اردو ادب میں ناسٹلجیائی موجودگی تقسیم ہند کے بعد سے واضح نظر آتی ہے ناسٹلجیا کا ذکر کسی نہ کسی طور پر ادب کی ہر صنف میں خواہ نثر ہو یا شاعری موجود ہے کیونکہ انسان ماضی سے کٹ نہیں سکتا۔

ناسٹلجیائی رجحان کے تحت لکھے جانے والے ناولوں میں انتظار حسین کا بستی، الطاف فاطمہ کا نشاط محفل، خدیجہ مستور کا آنگن، صدیق سالک کا پریشر ککر، عزیز احمد کا ایسی بلندی ایسی پستی، بانو قدسیہ کا راجہ گدھ، انتظار حسین کا "تذکرہ" اور آگے سمندر ہے، طارق محمود کا اللہ میگھ دے، خالدہ حسین کا کاغذی گھاٹ، انیس ناگی کا دیوار کے پیچھے وغیرہ شامل ہیں۔ المختصر ناول کی صنف میں کئی رجحان اور بھی ہیں جن میں آدرشی رجحان، فکاہیہ رجحان، فکشن رجحان شامل ہیں۔ جس کے تحت بے شمار ناول ایسے ہیں جو اپنے اپنے عہد کی عکاسی کرتے ہیں۔

مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اُردو ناول اپنے اندر عہد بہ عہد پوری داستان سموئے ہوئے ہے تاہم ناول کے اندر ہمیں ہر طرح کے موضوعات اور رجحان ملتے ہیں۔

ناسٹلجیائی رجحان کی ادب میں ابتداء:

قیام پاکستان ہی ایک ایسا لمحہ تھا جب خطے کے عوام ارضی پیوستگی کے شدید احساس کے تحت بے زمینی، عدم تحفظ اور عدم تشخص کی صورت میں زمانی و مکانی شعور کے ایک لرزہ خیز تجربے سے گزرے جو نہ صرف ان کیلئے بلکہ ادب کیلئے بھی نیا تھا۔ تقسیم کے وقت ہونے والے فسادات اور آبادی کی جبری منتقلی وہ سانحے تھے جنہوں نے براہ راست فرد کی ذات کو متاثر کیا۔ ان گنت انسانوں کو ان کی زمینوں سے اکھاڑ کر اجنبی زمینوں اور غیر مانوس تہذیب کی طرف دھکیل دیا گیا تھا۔ زمین سے بے دخلی کا احساس فرد کی شخصیت کو منہدم کر دیتا ہے کیونکہ یہ بے دخلی محض زمین سے رشتہ کا انقطاع نہیں بلکہ ایک پوری تہذیب اپنے ماحول، اپنی اقدار اور اپنی روایات اور اپنی زمین سے کٹ جانے کی صورت میں پیدا ہوتا ہے کو موضوع بنایا۔ اس ماضی کا کھونا جس سے وہ محروم ہو چکے تھے کو ادب کا موضوع بنایا۔ دیکھا جائے تو ناسٹلجیا حال کی گذشتہ تاریخ ہے جو ماضی کی منتشر کہانیوں کو واضح اور مضبوط کر کے موجودہ لمحے میں زندہ کرتا ہے۔

ادب میں تحریک آزادی کے حوالے سے نویں دہائی تک آتے ہوئے ہم ایک نئے ذائقے سے روشناس ہوتے ہیں جس کی دوسری شکل کو ایک فکری جہت بھی کہہ سکتے ہیں یہ جہت ناسٹلجیا سے تعلق رکھتی ہے۔

ناسٹلجیا کی فضاء پیدا ہونا ایک فطری امر ہے جہاں ایک جمے جمائے ماحول سے اچانک اٹھ کر دوسرے ماحول میں آجانا یا غریب الوطنی کے احساس سے دوچار ہو جانا ہوتا ہے۔ سرکار دو عالم (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی مکہ کو مدینہ میں یاد کرتے تھے۔ چنانچہ یہی صورتحال ہمارے یہاں ادیبوں کی بھی دیکھی جاسکتی ہے اس حوالے سے جو معروف نام سامنے آئے ہیں ان میں ایک بڑا ذکر انتظار حسین اور قرۃ العین حیدر کا ہے۔

تحریک آزادی کے تحت جو ادب تخلیق ہوا اور جو ناول لکھے گئے ان میں ایک جہت ناسٹلجیا سے تعلق رکھتی ہے یہاں مسئلہ صرف غارت گری اور تباہی و بربادی کا نہیں ہے بلکہ یہ انسانی فطرت ہے کہ اگر وہ رضاکارانہ طور پر ایک جگہ سے دوسری جگہ ہجرت کرے تو پرانی جگہ سے وابستہ یادوں کو بھلا نہیں سکتا بلکہ یہ یادیں کسی نہ کسی صورت اپنا جلوہ دکھاتی ہیں۔ اگر اسلامی تاریخ کے حوالے سے دیکھیں تو حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) مکہ میں مدینہ کو یاد کیا کرتے تھے۔

ناسٹلجیا کی ایک صورت خود اختیار کردہ مہاجرت کے نتیجے میں بھی سامنے آتی ہے۔ چونکہ ہمارے معاشرے میں مسائل میں پیچیدگی مسلسل چلی آرہی ہے لہذا لوگوں کے یہاں اپنے ماحول سے غیریت، بیگانگی اور ناسٹلجیا پیش در پیش چلا آرہا ہے۔ اپنے اپنے خاندان کیلئے وسیلہ رزق کی فکر میں تمام زندگی وطن سے دور اپنوں سے دور گزار لیتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے ہاں ناسٹلجیا جنم لیتا ہے۔ اس طرح غریب الوطنی کے اس احساس سے ناسٹلجیائی فضاء کا پیدا ہونا ایک لازمی امر ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ تشخص کی تلاش کا مسئلہ بھی جنم لیتا ہے۔ چونکہ اپنے ماحول، اپنے گھر اور شہر میں ہر شخص ایک طاقت اور مضبوطی سے سرشار ہوتا ہے جبکہ پردیس میں غیریت کے احساس کے ساتھ ساتھ شخصیت میں تنہائی اور بے یقینی کی کیفیات جنم لیتی ہیں۔ اس شخصی کمزوری سے عموماً بے تابی جنم لیتی ہے اور انسان ان لمحوں کو یاد کرتا ہے جب وہ اپنے ماں باپ، بہن بھائیوں اور دوستوں کے قریب ہوتا ہے۔ اس طرح وہ ماضی کے لمحوں میں سکون اور خوشی کو تلاش کرتا ہے اور اس تنہائی اور بے یقینی کی کیفیت سے فرار کی کوشش اختیار کرتا ہے جس کا حال میں وہ شکار تھا۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اُردو کا سارا ادب ہی ناسٹلجیا کی پیداوار ہے۔ ٹی ایس ایلیٹ کا کہنا ہے کہ حال، ماضی میں شریک ہے اور مستقبل میں بھی یعنی لمحہ موجود گزشتہ اور آئندہ سے جڑا ہوا ہے۔ اگر مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ہندو پاک میں انتظار حسین اور قرۃ العین حیدر اپنے انداز میں تاریخ کے عمل میں ٹوٹتی بگڑتی تہذیبوں کے نوحہ خواں ہیں۔ یہ نوحہ خوانی صرف جڑوں سے کٹ جانے کا نوحہ نہیں بلکہ انھیں تلاش کرنے کی کوشش بھی ہے۔ اس حوالے سے روبینہ الیاس کا کہنا ہے:

ماضی کی باز آفرینی کا شدت سے استعمال قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین کے یہاں ملتا ہے بلکہ افسانوں
میں ماضی کی باز آفرینی کی روایت کے موجد قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین ہی ہیں۔ [۲۳]

ناسٹلجیا میں ماضی کی خوشگوار یادیں ضرور پائی جاتی ہیں، ادیبوں کے ہاں جابجا یہ احساس ملتا ہے کہ انسان اپنی روایت سے کٹ کر نہیں رہ سکتا۔ اس حوالے سے ایک نظر اُردو ناول کی تاریخ پر ضروری ہے کیونکہ یہاں سے ہم اُردو ناول میں ناسٹلجیا کے رجحان کو بہتر انداز میں سامنے لا سکتے ہیں۔

اردو ناول کی ابتدا ایک ایسے دور میں ہوئی جب برصغیر سیاسی غلامی، معاشرتی پسماندگی اور ذہنی و جذباتی کشمکش کی لپیٹ میں تھا۔ یوں ناول میں کئی رجحان پیدا ہوتے چلے گئے۔ ہر دور میں ناول کی شکلیں تبدیل ہوئیں۔ لیکن معاشرے کی حقیقتوں اور سچائیوں کے عناصر ہی ناول کے اجزائے ترکیبی بنے رہے۔ یہاں فرد اپنی ذہنی و جذباتی آزادی محسوس کرتا ہے، جبکہ دوسری طرف ناسٹلجیا کی فضاء بھی پیدا ہونے لگتی ہے جب بے بسی، مجبوری، نوآبادیاتی نظام سے نفرت، غلامی، غربت، جہالت ماننے سے انکار اور ماضی سے بے تعلقی ملتی ہے۔

مجموعی طور پر قیام پاکستان کے بعد جتنا بھی ادب تخلیق ہوا (چاہے نثر ہو یا شاعری) ادب کی ہر صنف میں سب سے بڑا موضوع ہجرت کا نوحہ اور ماضی کی یادیں تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ناسٹلجیا ہمیں شاعروں کے ہاں بھی ملتا ہے۔ اس حوالے سے ناصر کاظمی ایک بڑا معروف نام ہیں۔ منیر نیازی جہاں رومان کی کلیاں بکھیرتے نظر آتے ہیں وہاں ماضی کے شدید احساس سے بھی دوچار نظر آتے ہیں۔ اسی طرح احمد مشتاق احمد کو بھی ناسٹلجیا کے ذکر میں فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

منیر نیازی کے ہاں ماضی کی یاد اور اس کا نوحہ سنائی دیتا ہے اُن کے ہاں گزرے زمانے کی محفلوں اور دوستوں کی رفاقتوں کا ذکر ملتا ہے مثلاً ایک جگہ اپنے جذبات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

یہ اجنبی سی منزلیں ، اور رفتگاں کی یاد
تنہائیوں کا زہر ہے اور ہم ہیں دوستو
آنکھوں میں اُڑ رہی ہے نئی محفلوں کی دھول
عبرت سرائے دہر ہے اور ہم ہیں دوستو [۲۴]

تاہم اسی طرح سے ناصر کاظمی بھی گزری یادوں اور ان لمحوں کو یاد کر کے اداسی کا شکار نظر آتے ہیں جو انہوں نے انبالہ میں گزارے۔ ان لوگوں کو یاد کرتے ہیں جنہیں وہ انبالہ چھوڑ آئے تھے۔

کیا زمانہ تھا کہ ہم روز ملا کرتے تھے
رات بھر چاند کے ہمراہ پھرا کرتے تھے [۲۵]

ن۔م۔راشد اپنے گزرے ہوئے وقت کو کچھ اس طرح سے یاد کرتے ہیں اور اپنے جذبات کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

زمانے بھر میں تاریکی سی چھائی ہے
مگر وہ یاد کے روزن سے آتی ہے نظر اب بھی
مجھے بھولی نہیں وہ بے بسی اس کی نگاہوں کی
اور اس کی آخری باتیں یاد ہیں اب تک!
مگر میں اس لیے تازہ افق کی جستجو میں ہوں
کہ اس کی یاد تک رو پوش ہو جائے [۲۶]

فیض احمد فیض اپنے دوستوں کو یاد کرتے ہوئے کہتے ہیں:

خیال و شعر کی دنیا میں جان تھی جن سے
فضائے فکرو عمل ارغواں تھی جن سے
وہ جن کے نور سے شاداب تھے مہ و انجم
جنون عشق کی ہمت جواں تھی جن سے
وہ آرزوئیں کہاں سو گئی ہیں میرے ندیم [۲۷]

مجید امجد بھی ماضی کی یادوں کا سہارا لیتے ہوئے، زندگی کے بے نشاں خوابوں کی دھند میں ان خواہشوں، جذبوں اور امنگوں کا اظہار اپنی شاعری میں کرتے ہیں جو ماضی کا حصہ بن گئے ہیں وہ پرانی بستیوں پیڑوں اور شاخوں کو یاد کرتے ہیں جو ایک صدائے بازگشت بن کر رہ گئے ہیں۔یوں پورا اردو ادب ماضی کی باز آفرینی کا نوحہ معلوم ہوتا ہے۔تاہم یہ ماضی پسندی مثبت قدروں کی بھی حامل ہے، جس سے نئے دور کا انسان جذباتی طور پر مستفید ہوتا نظر آتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ قاضی جاوید، "ناسٹلجیا کے بارے میں چند باتیں" مشمولہ ماہ نو (اکتوبر ۱۹۸۰ء)، ص-۲۶-۲۷۔

۲۔ شان الحق حقی (مترجم)، آکسفورڈ اردو ڈکشنری (آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۰۵)، ص ۱۱۱۔

۳۔ بشیر اے قریشی، پریکٹیکل ڈکشنری، لاہور (کتابستان پبلیشر، اردو بازار سرکلر) ص، ۴۸۹۔

۴۔ N. David B. Guarlnifon, *Websters, New Word Dictionary of the American Language*, David B. Guaralniform, The World Publishing Company, New York& Cleveland. P-973

۵۔ *The Oxford Encyclopedia Dictionary*, Bay Books in Association University Press. Page1154 with Oxford

۶۔ محمد عاصم بٹ، عبد اللہ: شخصیت اور فن (اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان ۲۰۰۸ء)، ص ۵۸۔

۷۔ بی بی امینہ، خالدہ حسین : شخصیت اور فن (اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۱۷ء)، ص ۴۷۔

۸۔ ممتاز احمد خان، آزادی کے بعد اردو ناول (کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۷۷ء)، ص ۱۷۸۔

۹۔ www.allencounlyky.com/info/old.disease.html . بتاریخ ۱۲ اکتوبر ۲۰۲۰ء۔

۱۰۔ www.merrian.webster.com/distionary/nostalgia بتاریخ ۱۳ اکتوبر ۲۰۲۰ء۔

۱۱۔ www.allencounlyky.com/info/old/disease.html بتاریخ ۱۰ اکتوبر ۲۰۲۰ء۔

۱۲۔ bid/بتاریخ ۷ نومبر ۲۰۲۰ء۔

۱۳۔ مشتاق احمد یوسفی، آب گم (کراچی: مکتبہ دانیال، بار ششم، ۲۰۰۵ء)، ص ۲۰۔

۱۴۔ ایضاً

۱۵۔ ممتاز احمد خان، آزادی کے بعد اردو ناول (کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۷۷ء)، ص ۲۴۳۔

۱۶۔ ممتاز احمد خان، "جدید اردو ناول" مشمولہ آج کا اردو ادب، فیروز سنز لمیٹڈ، ۱۹۷۰ء)، ص ۲۷۔

۱۷۔ رفیع الدین ہاشمی، اصناف ادب (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء)، ص ۱۱۔

۱۸۔ ممتاز احمد خان، آزادی کے بعد اُردو ناول (کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۷۷ء)، ص ۱۳۵۔

۱۹۔ عبادت بریلوی، اردو ادب میں جدید رجحانات (اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۱۹۸۳ء)۔

۲۰۔ احسان اکبر، پاکستانی ناول ہیئت اور رجحان (کراچی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۹۷ء)، ص ۱۳۵۔

۲۱۔ عبداللہ حسین، اداس نسلیں (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۶۳ء) ص ۴۹۴۔

۲۲۔ منیر نیازی، کلیات منیر (لاہور: ماورا پبلی کیشنز، ۱۹۸۶ء)، ص ۲۸۔

۲۳۔ ایضاً۔

۲۴۔ ن۔م۔راشد،کلیات ن۔م۔ راشد(لاہور: ماورا پبلی کیشنز، س۔ن)، ص۱۱۹۔۱۲۰۔

۲۵۔ فیض احمد فیض،نسخہ ہائے وفا(نقشِ فریادی)،(لاہور: مکتبہ کارواں، س۔ن)، ص۵۶۔

باب دوم:

اردو کے منتخب نمایاں ناول نگاروں کے ہاں ناسٹلجیائی عناصر

ناسٹلجیا کے اسباب:

قیام پاکستان کا واقعہ برصغیر پاک وہند کی تاریخ کا ایک ایسا لمحہ تھا جب اس خطے کے عوام ارضی پیوستگی کے شدید احساس کے تحت بے زمینی، بے جڑی، عدم تحفظ اور عدم تشخص کی صورت میں زمانی و مکانی شعور کے ایک ایسے لرزہ خیز تجربہ سے گزرے، جو ان کی زندگیوں کے ساتھ ساتھ ادب کے لیے بھی نیا تھا۔ اس طرح دو قومی نظریے کے تحت وجود میں آنے والے اس نئے ملک کا قیام تہذیبی و ثقافتی بنیادوں پر ماضی اور حال کے درمیان ایک ایسی خلیج پیدا کرنے کا موجب بنا، جس کا تعلق محض نظریاتی وفاداریوں سے ہی نہیں، بلکہ انسان کے اجتماعی شعور کی وابستگی سے تھا۔ اس اجتماعی شعور کا اظہار اُردو فکشن میں مختلف طریقوں سے ہوتا رہا ہے۔

تاریخ انسانی کا جائزہ لیا جائے تو نقل مکانی کا عمل ایک مسلسل سفر کی صورت میں اثر پذیر ہوا ہے، جو محض جسمانی سفر ہی نہیں ذہنی سفر بھی ہے۔ یہی ذہنی سفر انسان کو بیک وقت حال اور ماضی میں یکساں متحرک رکھتا ہے جو بالآخر "ناسٹلجیا" یا "یادِ ماضی" کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

۱۹۴۷ء تقسیم ہند کے بعد منظر عام پر آنے والے ادب میں ناسٹلجیائی رجحان نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے۔ جس کی متعدد وجوہات ہیں ان میں سے چند ایک اہم وجوہات عصری صورتحال کی تلخی، ہجرت کا کرب، مسرت اور سکون کی تلاش، تشخص کی تلاش، سیاسی، معاشرتی و تہذیبی ورثے سے دوری کا غم، انسانی رشتوں کے بچھڑنے کا غم، قیام پاکستان کے بعد سیاسی حالات جن میں مارشل لاء، ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ، دوسرا مارشل لاء، ۱۹۷۱ء میں سانحہ بنگال اور اسی کے نتیجے میں بے یقینی، لاتعلقی اور بے جڑ ہونے کا احساس ہیں۔ انہیں ہم ناسٹلجیا کے وہ فکری عناصر کہہ سکتے ہیں جو قیام پاکستان کے بعد اُردو ادب میں ناسٹلجیا کا باعث بنے۔

۱۔ عصری صورتحال کی تلخی:

تقسیم ہند کے سانحے نے اردو ناول پر اپنے دوررس اثرات مرتب کیے۔ تقسیم کے وقت ہونے والے فسادات اور جبری منتقلی ایسے سانحے تھے جنہوں نے براہ راست فرد کی ذات کو متاثر کیا اور ان گنت انسانوں کو ان کی

تہذیب اور ان کی زمینوں سے اکھاڑ کر اجنبی اور غیر مانوس تہذیب کی طرف دھکیل دیا اس حوالے سے رشید امجد کا کہنا ہے:

> ۱۹۴۷ء میں برصغیر دو علیحدہ مملکتوں میں تقسیم ہو گیا لیکن اس کے ساتھ ہی ایک بڑا انسانی المیہ وجود میں آیا۔ اتنی بڑی سطح پر انسانی خون کی ارزانی اور انسانی وقار کی بے حرمتی نے علیحدہ مملکت کی خوشی کو ایک بہت بڑے دکھ اور سوگ میں بدل دیا۔[1]

تقسیم ہند ایک طرف تو حیات نو کا پیغام لائی اور دوسری طرف اس نے اپنے پیچھے ہزاروں داستانیں خون سے رقم کیں۔ جن کی ہولناکی ابھی تک برقرار ہے۔ بظاہر وقت (جو کہ بہت بڑا مرہم ہے) نے ان زخموں کو مندمل کر دیا ہے لیکن اندر ہی اندر یہ زخم ابھی تک ہرے ہیں۔ ذرہ سی آنچ بھی ان زخموں کی کھرونڈ اتار دینے کے لیے کافی ہوتی ہے، جس نے جسم کو ہی نہیں روح تک کو چھلنی کر دیا۔ بیگانوں کا تو ذکر کرنا ہی کیا اپنوں نے بھی ایسے زخم دیے کہ اعتبار ختم ہوئے، عزتیں لٹیں اور روحیں زخمی ہو گئیں بقول ڈاکٹر محمد ذاکر:

> فرقہ وارانہ تعصب اور کشت و خون کے جو مظاہرے ان دنوں دیکھنے میں آئے مہذب دنیا میں اس کی مثال شاید ہی ہو۔ گھر کے گھر اجڑ گئے، مکان جلا کر خاک کر دیے گئے، بے گناہ مسکین دربدر مارے مارے پھرنے پر مجبور ہو گئے۔[2]

ادب ایسے ہی سانحات اور حادثات کا منتظر ہوا کرتا ہے، چونکہ ادب زندگی کا عکاس ہے اس لیے ان واقعات کی عکاسی کرتا ہے جو ارد گرد وقوع پذیر ہو رہے ہوتے ہیں۔ آنے والی نسلیں ادب کے ذریعے ہی ان واقعات کو از سر نو محسوس کرتی اور جانتی ہیں کہ، انسانی خون نے کس طرح انسانی لبوں کو سیراب کیا، انسان کی درندگی، وحشت، بربریت اور بہیمیت سبھی رنگوں سے واقف ہوتی ہیں۔

قرۃ العین حیدر کا ناول "میرے بھی صنم خانے" ایسا ہی شاہکار ناول ہے، جس میں تحریک آزادی ایک ایسے صدمے کے طور پر براجمان ہوئی ہے جو جمی جمائی زندگی کے اکھڑنے کا استعارہ ہے۔ ناول میں ایک جگہ کہتی ہیں:

> پرانے خاندان مٹ گئے، زندگی کی پرانی قدریں خون اور نفرت کی آندھیوں کی بھینٹ چڑھ گئیں، ایک عالم تہہ و بالا ہو گیا۔[3]

تقسیم ہند کے حوالے سے اردو ادب میں بیش بہا اضافے ہوئے، خاص طور پر فکشن میں اور فکشن میں بھی ناول اور افسانے میں۔ عصری صورتحال کی تلخی نے ان لکھنے والوں کے ہاں ناسٹلجیا کو جنم دیا۔

قرۃ العین حیدر کا ناول "سفینہ غم دل" ایسی ہی عکاسی کرتا ہے۔ ۱۹۵۲ء میں شائع ہونے والی اس ناول کا موضوع ہندو مسلم فسادات کی دردناک صورتحال ہے۔ تقسیم کے بعد بے شمار لوگ قتل کر دیے جاتے ہیں اور

خاندان بکھر جاتے ہیں۔ سارے ناول میں یہ واقعات بکھرے ہوئے ہیں جو کہ اس دور کی صورتحال کی عکاسی کرتے ہیں اقتباس ملاحظہ ہو:

> ارنسٹ برومل کیا تم بھول رہے ہو کہ ہم سب ایک اندھیرے سے نکل کر دوسرے میں دھکیل دیے گئے ہیں۔ زندگیاں جیل خانوں اور کنسٹر کشن کیمپوں اور رفیوجی بستیوں کا ایک لامتناعی سلسلہ ہیں۔[۴]

قیام پاکستان کے بعد اردو ناول میں تقسیم اور اس کے نتیجے میں ہونے والی نقل مکانی، اس کے منفی اثرات، اپنی زمینوں سے اکھڑ جانے کا غم، نئی زمینوں میں آباد کاری کا مسئلہ، اجنبیت اور محرومی کا احساس، شکستہ خوابوں کی کرچیاں ہمیں جابجا بکھری ملتی ہیں۔ عرصہ گزر جانے کے بعد بھی لوگ ماضی میں بسیرا کیے ہوئے ہیں یہی چیزیں ان کے ہاں ناسٹلجیا کے جنم لینے کا باعث بنتی ہیں۔

ہجرت کا کرب:

ابتدائے آفرینش سے ہی انسان کبھی زندگی کی ضرورتوں کے تحت اور کبھی جنگ و جدل کی وجہ سے ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کرتا رہا ہے۔ اگر ماضی اور آج کی دنیا پر نظر ڈالی جائے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ لوگوں نے ظلم و ستم سے بچنے کیلئے ایک ملک سے دوسرے میں ہجرت کی ہے یا معاشی ترقی کیلئے ایسا کیا گیا جس طرح آج کل نوجوان مغرب کی نقالی کر رہے ہیں۔

قیام پاکستان کے عمل کے نتیجے میں ہجرت کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہو گیا کہ مسلمان کے قافلے اس راہ میں برباد ہوئے اور جو بچے وہ پاکستان میں داخل ہوئے:

> ہوائی اڈے پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ جہاز کل جائے گا رات اڈے پر آنکھوں ہی آنکھوں میں کاٹی کہ وہاں بھی لوٹ مار ہو چکی تھی صبح جہاز چلنے شروع ہوئے تو سوار ہونے سے پہلے سامان کی تلاشی لی گئی اور جتنا کپڑا اور چیزیں تھیں سب یہ کہہ کر چھین لیں کہ یہ ہندوستان کا مال ہے اب پاکستان جاؤ اور وہاں کماؤ۔[۵]

قیام پاکستان کے بعد جبری طور پر لوگوں کو ہندوستان سے پاکستان ہجرت پر مجبور کیا گیا۔ لٹے پٹے پناہ گزینوں کا ایک سیلاب پاکستان کی طرف جاری کر دیا گیا، لاکھوں انسانوں کے گھر بار، عزیز رشتہ دار اور مٹی کی خوشبو کو چھوڑ کر اپنے اپنے خوابوں کی تعبیر آنکھوں میں بسا کر ساتھ ہی جانے کے فطری جذبے سے مجبور ہو کر لاکھوں کی تعداد میں سرحدوں کی جانب نقل مکانی کا دکھ سہتے رہے۔

> ٹرین جوں کی چال چل رہی تھی جب بیاس سے گاڑی گزری تو منظر دیکھا نہ گیا ہماری گاڑی سے پہلے والی ٹرین کو کھڑا کر کے تہہ تیغ کیا گیا تھا۔ تمام مسلمانوں کے اعضاء بکھرے پڑے تھے کسی فرد کی نیچے اترنے کی اجازت نہ تھی اور نہ ہی پانی پینے کی اجازت تھی کیونکہ اسٹیشن پر کنوؤں میں زہر ملا دیا گیا تھا۔[۶]

ہجرت کے اس ہولناک سانحے میں انسانی المیے، انتہائی پیچیدہ مسائل اور بے پناہ معاشی، سیاسی اور معاشی بحران پیدا ہوتے ہیں لیکن سب سے شدید عمل ناآسودگی اور احساس زیاں کی صورت میں جنم لیتا ہے اور اسی سے وہ منفی رویے، طرز احساس اور نفسیاتی کیفیت پیدا ہوتی ہے جسے عام طور پر ناسٹلجیا کہا جاتا ہے۔

ماضی کی حسین یادوں، حال کی بھیانک حقیقتوں کے ساتھ مل کر تلخی کا روپ دھار لیتی ہے اور انسان کی اپنی بے بسی ماضی کو کریدتی تو رہتی ہے مگر ابدی خوشی حاصل کرنے سے محروم رہتی ہے۔ اسی کا اظہار اردو فکشن میں مختلف ادیبوں کے ہاں ملتا ہے۔

ہجرت جلاوطنی اور ترکِ وطن کے عارضی یا مستقل اسباب ہمیشہ اذیت ناک ہوتے ہیں مگر دنیا کے بڑے تخلیق کاروں نے اسی اذیت کو ایک عظیم الشان تخلیقی تجربہ بنالیا۔ اردو ناول کی تاریخ میں ایسے بہت سے ناول نظر آتے ہیں جن میں ہجرت کے دکھ کے نتیجے میں ناسٹلجیا کا رجحان پروان چڑھتا ہوا نظر آتا ہے۔

عبدالصمد کا ناول "دو گز زمین" میں تحریک آزادی ہندوستان کے بٹوارے اور پھر پاکستان میں ہندوستان سے ہجرت کر کے یہاں مقیم ہو جانے کی بہار کی فیملی کے اقدار میں تبدیلی کو اس ناول کی بنیاد بنایا گیا ہے۔

امراؤ طارق کے ناول "معتوب" میں بھی ہجرت کے دکھ اور ناسٹلجیا کے احساس کی بازگشت ہے۔ اشرف شاد کا ناول "اے وطن" ان پاکستانی افراد کی کہانیاں سناتا ہے جو یہاں سے بہتر مستقبل کی خاطر ہجرت کرتے ہیں اور مسائل میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ فہیم اعظم کا ناول "جنم کنڈلی" ایک نئی ہیت میں پیش کردہ ناول ہے جس میں ہجرت اور ناسٹلجیا کے حوالے سے قنوطیت کا اظہار ہے ان کے خیال کے مطابق لاحاصلی اور ناآسودگی انسان کا مقدر ہے۔

رضیہ فصیح احمد کا ناول "صدیوں کی زنجیر" وسیع کینوس پر پھیلا ہوا ہے جس کا تعلق تقسیم ہند سے متعلقہ انسانی المیہ سے ہے۔ یعنی سیاسی اتھل پتھل کے بطن سے فسادات کا پھوٹ پڑنا، انسان کا انسان سے بربریت والا سلوک کرنا، ہزاروں اور لاکھوں انسانی جانوں کا ضیاع، ہجرت اور پھر ناسٹلجیائی کرب اور اس کے ساتھ نئی منفی اقدار کی تشکیل اور نئی مٹی میں اپنی پرانی جڑوں کا اتصال کرنا، اس کہانی کا تعلق ہجرت اور اس کا المیہ ہے۔

الطاف فاطمہ کا ناول "چلتا مسافر" سقوطِ مشرقی پاکستان کے تناظر میں لکھا گیا ہے۔ ناول میں ملکوں کی تقسیم و سماجی پہلوؤں اور انسانی المیوں کا ظہور اور ہجرت کے کرب کے حوالوں کا بیان ہے۔

عبداللہ حسین کا ناول اداس نسلیں تقسیم ہند کے تناظر میں لکھے گئے ناولوں میں سے ایک ناول ہے۔ ناول میں یو۔ پی اور پنجاب کے درمیان کی دوئی کو پیش کیا گیا ہے۔ کہانی روشن پور گاؤں کی ہے جہاں کی آبادی مسلمانوں، سکھوں اور ہندوؤں پر مشتمل ہے۔ کہانی کا آغاز پہلی جنگ عظیم سے ہوتا ہے جب پاکستان کے لیے تحریک

آزادی کا باقاعدہ آغاز نہیں ہوا تھا۔ مگر یہ احساس مسلمانوں اور ہندوؤں کو تھا کہ انگریز کو بالآخر یہاں سے واپس اپنے دیس جانا ہوگا۔ عصری زندگی کے تمام مسائل اور خاص طور پر زندگی کی معصومیت کی تلاش اس ناول میں موجود ہے۔ نعیم جو اس ناول کا مرکزی کردار ہے زندگی کے مختلف واقعات و حادثات سے گزرنے کے بعد خاص ذہنی انتشار کا شکار ہے۔ ناول میں ایسے واقعات ہیں جب انسان اپنی جان و مال کو بچانے کیلئے باقی سب کچھ بھول جاتا ہے۔ نعیم انہی دہشت ناک مناظر کو دیکھتا قافلے میں شامل رہتا ہے۔

> لوگ مر رہے تھے جو مارے جانے سے بچ رہے تھے وہ تھک کر گر رہے تھے، سامان کو آگ لگائی جا رہی تھی اور لوگ خوراک کے لیے آپس میں لڑ رہے تھے۔ سڑک پر اور سڑک کے کنارے لاشوں کا طویل سلسلہ تھا۔ کوئی پلیا کے پتھر کے سہارے بیٹھا اور کوئی درخت کے ساتھ کھڑا کھڑا مر گیا تھا۔ عورتوں کے ننگے مردہ جسم بے شرمی سے پھیلے ہوئے تھے اور جنگلی جانور اور پرندے ان پر پل رہے تھے۔ جو زندہ تھے وہ مستقل چل رہے تھے اور میاں بیوی، بہن بھائی اور ماں بچے کے رشتے ختم ہو رہے تھے اور وہ سب کچھ ہو رہا تھا جو دنیا کی تاریخ میں ایسے قافلوں کے ساتھ ہوتا آیا ہے۔[۷]

اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود آج بھی ہجرت کے نتیجے میں پروان چڑھنے والے رجحان ناسٹلجیا کو بیان کیا جا رہا ہے۔ ۱۹۹۵ء میں انتظار حسین نے "آگے سمندر ہے" لکھ کر ناول کی دنیا میں اضافہ کیا۔ اس کا عنوان قارئین کو چونکا دیتا ہے اور اپنی جگہ معنی خیز بھی ہے۔ کراچی میں ہندوستان کے مختلف علاقوں سے آنے والوں لوگوں میں جو میل ملاپ ہوا، اس سے سماجی و معاشرتی ماحول میں ایک ندرت پیدا ہوئی۔ ایسا دنیا کے ہر اس علاقے میں ہوتا آیا ہے، جہاں ہجرت کرنے والوں کا اجتماع ہو اس سے جو مزاح، لوگوں کی گفتگو، معاشرتی رکھ رکھاؤ، عادات و اطوار اور بے ضرر تعصبات سے پیدا ہوتا ہے اس کی چاشنی ناول میں جان پیدا کرتی ہے۔ "آگے سمندر ہے" میں ہجرت کے حوالے سے ناسٹلجیا تہہ در تہہ موجود ہے۔ انتظار حسین ہجرت کی بدولت حاصل ہونے والے ناسٹلجیا کو اپنے فکشن (افسانہ، ناول) میں بہت خوبصورتی سے استعمال کرتے ہیں۔

> اندلس کی تاریخ بھی اپنی جگہ پر فسانہ عبرت ہے۔ مسلمانوں نے کیا عروج پایا اور کس طرح قعر مذلت میں گرے کہ صفحہ ہستی سے ہی نابود ہو گئے اور وجہ بس ایک دین سے پھر گئے۔[۸]

مسرت و سکون کی تلاش:

پاکستان کا قیام اندھیرے میں روشنی کے مترادف تھا۔ بے شمار لوگ جنہیں ہجرت کا کرب سہنا پڑا ان کے لیے پاکستان کا آسرا کافی تھا۔ قیام پاکستان کے وقت لوگوں کے دلوں میں ایک امید تھی کہ پاکستان کی سرزمین اپنی ہو گی۔ وہاں پر اپنی مرضی کی زندگی ہو گی۔ خوراک، لباس اور سر چھپانے کیلئے چھت میسر آئے گی آئے گی، لیکن بہت

سے لوگوں کے یہ خواب چکنا چور ہو گئے۔ امیدیں اور توقعات پامال ہوئیں۔ امیدوں کی یہ پامالی پہلے دکھ اور پھر ایک زہر خند کی شکل اختیار کر گئی۔ حسن کا اظہار ہمیں شوکت صدیقی کے ناول خدا کی بستی میں ملتا ہے۔

جمہوریت کسی ملک کی تعمیر و ترقی میں بڑا اہم کردار ادا کرتی ہے لیکن اس کے لیے جمہوریت کا اپنی اصل صورت میں ہونا لازم ہے جمہوریت میں عوام کی حکومت ہوتی ہے لیکن یہاں جمہوری حکومت میں سرمایہ دار غریب کی غربت سے مکمل فائدہ اٹھاتا ہے۔ ناول میں اس کی تصویر کشی یوں کی گئی ہے:

> خان بہادر نے فی ووٹ دس روپے کا ریٹ مقرر کر دیا تھا اس کے تین انتخابی دفتر قائم تھے جن میں آئے دن ضیافت ہوتی، دیگیں چڑھتیں، بڑی فیاضی سے مرغن کھانے کھائے جاتے جو لوگ بڑھ چڑھ کر باتیں کرنے والے اور سیدھے سادھے لوگوں کو چکمہ دینے کا گر جانتے تھے خان بہادر نے انہیں چھانٹ چھانٹ کر اپنے کارکنوں کی حیثیت سے بھرتی کر لیا تھا۔[9]

ناول میں انسان کا مقدر نا آسودگی کی صورت میں دکھایا گیا ہے، جس سے نجات کے راستے بند ہیں۔ ماضی سے حال کی طرف واپسی، حال جو کبھی بھی ماضی کا نعم البدل نہیں ہو سکتا۔ حال جتنا بھی پر آسائش کیوں نہ ہو ماضی کی کشش اور اس سے محروم ہو جانے کا یہ احساس حال کی آسائشوں کو بے لذت و بے کیف بنا دیتا ہے۔ صدیوں کے رشتوں، ماضی کی بازیافت اور وقت کے تسلسل کو اپنی گرفت میں لینے کی خواہش قرۃ العین کے ناولوں کے کرداروں کے یہاں فطری طور پر ابھرتی ہے۔ قرۃ العین حیدر کا ناول آگ کا دریا محض اڑھائی ہزار سال کی تاریخ نہیں، بلکہ اس میں زندگی کو تمام تر تنوعات کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اس میں گوتم کو ہندوستان کی روح کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ اپنے آشرم جہاں سے وہ علم و دانش کی زندگی کا آغاز کرتا ہے اس کا اخیر بھی ایسے ہی مقام پر ہوتا ہے۔ نو آبادیاتی دور گزر چکا ہے برصغیر تقسیم ہو گیا ہے، فرقہ وارانہ فسادات نے قلب و ذہن پر ایسے گھاؤ لگا دیے ہیں جو ناقابل مندمل ہیں۔ نفرتوں کی دیواریں کھڑی ہیں اور پرانا کلچر تار تار ہو گیا ہے۔ یہی چیزیں آگ کا دریا میں تقسیم کے حوالے سے ناسٹلجیا کا سبب بنتی ہیں۔

تشخص کی تلاش:

انسان کا بنیادی مسئلہ خود شناسی کا ہے زندگی کے سفر میں اپنی حیثیت یا اپنے تشخص کی تلاش ہی فرد کے لیے اہم ہے۔ دونوں کی عدم موجودگی افراد اور ماحول کے درمیان مغائرت کو جنم دیتی ہے۔

تقسیم ہند کے بعد فرد کے لیے سب سے بڑا مسئلہ اپنی شناخت سے محروم ہونا تھا۔ جو بالآخر فرد کی ذات کے بکھرنے کا سبب بنا۔ انسانی فطرت خود کو وابستہ کرنے کی عادی ہے۔ چیزوں، لوگوں اور جگہوں سے اس کی وابستگی، اس کو مستقل کرب میں مبتلا رکھتی ہے اور اس کا وجود ہونے نہ ہونے کے درمیان مضمحل رہتا ہے۔ وجود کا یہ اضمحلال اس کی

شناخت کا مسئلہ بن جاتا ہے اور وہ وقتی طور پر اپنی یاداشت سے پناہ حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ شناخت کا یہ مسئلہ اس وقت شدت اختیار کر لیتا ہے جب کبھی ماضی کو کریدنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

تقسیم ہند کے نتیجے میں محض نئی زمینوں میں آباد کاری ہی انسان کے لیے مسئلہ نہیں بنی بلکہ فرد کی جذباتی زندگی بھی مجروح ہوئی۔ انسان کسی بھی جگہ رہے کسی بھی مقام پر پہنچ جائے، اس جگہ کو بھول نہیں پاتے جہاں ان کی جڑیں ہیں یہی کرب ناسٹلجیا کو جنم دیتا ہے اس کی بہترین مثال انتظار حسین کا ناول بستی ہے۔

بســـــتی کا بنیادی موضوع ہجرت کے بطن سے پھوٹنے والا انسان اور معاشرے کا زوال ہے۔ انتظار حسین نے روپ نگر اور ویاس پور کی معاشرتی فضاء کے بیان سے ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کی آویزش تک محض سیاسی مد و جزر نہیں گنوائے بلکہ عام انسانوں کی نفسیات پر یہ واقعات جو اثر ڈالتے ہیں اسے بیان کیا ہے۔ پورے ناول میں یہ واقعات مرکزی کردار کے ذہنی سفر کا ایک حصہ بن کر سامنے آتے ہیں مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں:

> یہ میں ہوں یا میرا ملبہ؟ کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے میں بکھر گیا ہوں میرے ارد گرد سب کچھ بکھر گیا ہے۔ وقت بھی، اس ایک وقت کے بطن سے اتنے وقت تھے۔ [۱۱]

ناول کی ہیرو ذاکر کو اپنے گمشدہ پیڑ، گمشدہ پرندے، گمشدہ صورتیں، نیم کے موئے ٹہنوں میں پڑے ہوئے جھولے سب نظر آتے ہیں۔ دوسرے کرداروں کو اپنے ملک میں اس سکون کی تلاش ہے جو مفقود ہے۔ کچھ چاہتے ہیں کہ تقسیم ہند اور ہجرت کے آدرش اپنا ثمر دیں۔ دراصل ذاکر اُسی سکون کا متلاشی ہے جو ماضی میں اسے روپ نگر میں حاصل تھا لیکن چونکہ وہ سب ویسا نہیں چنانچہ ناسٹلجیا کے مختلف مناظر ناول میں رقصاں دکھائی دیتے ہیں۔

عاصم بٹ کے ہاں کوئی ابہام یا پیچیدگی دکھائی نہیں دیتی وہ توقعات کے دھندلکے میں انسانی اعمال، رویوں اور انوکھے خیالات کو واضح کر کے دکھاتے ہیں۔ ان کا ہیرو آصف زود حساسیت کے باعث اپنی پہچان اور تشخص کی گمشدگی کا شکار ہے۔ جس کا سبب بچپن سے گزاری بحران در بحران زندگی اور سوچ کی آتش فشانی ہے۔ یہی وہ مسئلہ ہے جس کا شکار قیام پاکستان کے بعد تقریباً ہر ذی شعور انسان بنا تشخص کی تلاش اس دور میں ہر فرد کا مسئلہ رہا اور اسی اضطرات نے ان کے ہاں ناسٹلجیا کو جنم دیا۔

انسانی رشتوں کا انہدام:

تقسیم کے سبب معاشرتی، تہذیبی، معاشی مسائل کے علاوہ ایک اور مسئلہ بھی پیدا ہوا۔ وہ انسانی رشتوں کی پامالی، انسانی اقدار کی پستی اور انسان کا انسانیت کے درجے سے گر جانا تھا۔ جمے جمائے معاشرے کی اُتھل پتھل، تہذیبی

زوال اور انسانوں میں روحانی خلا جیسے موضوعات ہمیں آزادی کے بعد اردو ناول میں نظر آتے ہیں مثلاً قرۃ العین حیدر اپنے ناول "میرے بھی صنم خانے میں" لکھتی ہیں:

> جہاں سبھی کا ایک دوسرے سے صدیوں کا بھائی چارہ اور میل ملات تھا سبھی ایک دوسرے کو کسی نہ کسی رشتے داری کے نام سے پکارتے آئے تھے۔ سبھی ایک دوسرے کے دکھ درد سے شریک تھے۔ آج دس بلم برداروں کی مخالفت میں وہ اس قصبے میں داخل ہوئے تھے۔[11]

یہ اقتباس ایک طرف آزادی کے دیے گئے مخصوص دکھوں کی طرف اشارہ کرتا ہے تو دوسری طرف اودھ کے تعلقے داروں کی مخصوص زندگی میں روحانی خلا کو بھی پیش کرتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ان کی مادی زندگی کے نفسیاتی عوارض کو سامنے لاتی ہیں ان کی تہذیب شکست وریخت کا شکار ہوتی ہے۔ ان کی مخصوص اقدار بوسیدگی کا شکار ہو جاتی ہیں۔ ان کے ہاں انسانی رشتوں کا تقدس واحترام ختم ہو رہا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ اپنے خوابوں کی دنیا میں زندہ رہنے کی کوشش کرتے ہیں اور یوں ان کے ہاں ناسٹلجیا جنم لیتا ہے۔

قیام پاکستان کے بعد سیاسی حالات:

پاکستان کا قیام محض ایک ریاست کا قیام نہیں تھا بلکہ اس کے ساتھ پاکستان اور بھارت کے مابین مختلف نسلی جمعیتوں کے چھوٹے بڑے حصوں کا تبادلہ آبادی بھی ہوا۔ اسی دوران ہولناک فسادات بھی برپا ہوئے۔ غیر مسلموں کے پاکستان سے چلے جانے کے بعد یہاں سے غیر مسلم غلبہ بھی ختم ہو گیا۔ حصول پاکستان کے بعد قائد اعظم محمد علی جناح پہلے گورنر بنے۔ اس وقت پاکستان کی صورتحال یہ تھی کہ یہاں کوئی مرکزی انتظامیہ نہیں تھی، ہر چیز کو نقطہ آغاز سے شروع کرنا تھا، پاکستان کے پاس اس دور میں صرف خام مال موجود تھا اس مقصد کیلئے کراچی میں ایک ڈھانچہ تیار کیا گیا لیکن اُس وقت تو ہمارے پاس نہ فائل تھی نہ کوئی ٹائپ رائیٹر۔ حتیٰ کہ ہمارے پاس کام چلانے کیلئے اسٹیشنری بھی نہیں تھی۔ صرف یہی نہیں برطانوی راج میں قریباً تمام مصنوعات، فیکٹریاں، مشنریاں زیادہ تر ان حصوں میں لگائی گئی جو کہ بعد میں ہندوستان کا حصہ بن گئے۔ اس اعتبار سے بھی پاکستان کو اپنی صنعت و تجارت کا بالکل ابتدائی سطح سے شروع کرنا پڑا۔ اُس دور میں پاکستان کے پاس صرف خام مال موجود تھا یہ حقیقت بھی بڑی حوصلہ افزا تھی کہ مغربی پاکستان مثالی نہری نظام اور ریلوے کی نقل وحمل کی وافر سہولتیں موجود تھیں۔ ملک میں چھوٹی موٹی صنعتیں بھی قائم ہیں لیکن مشرقی پاکستان میں ایسی کوئی سہولت موجود نہ تھی لیکن یہ معجزہ ہے کہ نوزائیدہ ملک نے بہت جلد صنعتی ترقی کا آغاز کر دیا۔ کوئلے کی کمی کو پن بجلی سے پورا کیا جانے لگا اور دوسرے ملکوں سے تعاون حاصل کرنے کیلئے دوستانہ تعلقات کو بھی فروغ دیا جانے لگا۔

ایک طرف یہ مشکلات تھیں تو دوسری طرف فوری طور پر آئین بنانا بھی قدرے مشکل تھا یہ ذمہ داری آئین سازی اور قانون سازی کی اسمبلی کو سونپ دی گئیں۔ چنانچہ ۱۹۵۶ء کو اواخر تک آئین کا ایک خاکہ اسمبلی میں پیش کر دیا گیا۔ محمد علی بوگرہ نے اپریل ۱۹۵۴ء تک آئین کا ایک خاکہ اسمبلی میں اپنا آئینی فارمولا پیش کیا اس کے تحت مقننہ دو ایوانوں پر مشتمل تھی اس دوران میں مشرقی پاکستان میں لسانی بنیادوں پر نمائندگی کی ایک لہر اٹھی اور اس کے ساتھ ہی وہاں کے لوگوں نے جداگانہ نیابت کا مطالبہ اٹھایا۔ یہی وہ دور تھا کہ جب مغربی پاکستان کے چاروں صوبوں کو ایک یونٹ کی صورت میں قائم کرنے کے تقاضے سر اٹھانے لگے۔ ۲۴ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو گورنر جنرل غلام محمد نے اس دستور ساز اسمبلی کو توڑ دیا اور آئین سازی کی ساری کاروائی کو کالعدم قرار دے دیا۔ محمد علی بوگرہ کے ساتھ اس کابینہ میں کمانڈر ان چیف جرنل محمد ایوب خان، میجر جنرل سکندر مرزا اور حسین شہید سہروردی شامل تھے۔ چوہدری محمد علی کی قیادت میں ایک مخلوط وزارت بنادی گئی انہوں نے آئین سازی کے کام کو فوقیت دی۔ انہوں نے مختلف اراکین اسمبلی کے ممبروں اور دیگر متعدد ماہرین سے بحث و مباحثے کے بعد آئین کا مسودہ تیار کیا جو ۸ جنوری ۱۹۵۶ء کو حتمی منظوری کے بعد ملک میں نافذ کر دیا گیا۔

مشرقی پاکستان کا سارا المیہ بظاہر ایک سیاسی المیہ تھا مگر یہ محض سیاسی نہ تھا اس کے پیچھے متعدد محرکات پوشیدہ تھے مثلاً لسانی، ثقافتی محرکات۔ چونکہ پاکستان جب معرض وجود میں آیا تو یہ ایک کثیر لسانی مملکت تھی۔ ہر صوبے کی اپنی خاص زبان تھی اور ریاستی سطح پر بھی مختلف علاقائی زبانیں بولی جاتی تھیں۔ زبانیں صرف بول چال کی حد تک اپنا تحرک رکھتی ہوں تو مسائل پیدا پیچیدہ نہیں ہوتے، مگر لکھنے پڑھنے کے عمل میں زبان کی اہمیت وجہ حقیقت ہو تو مسئلہ پیچیدہ ضرور ہوتا ہے یہی معاملہ مشرقی پاکستان کے سلسلے میں ہوا۔

کسی بھی قوم کی تاریخ میں ہونے والے کسی بھی بڑے واقعے کا اثر اس قوم کے ادب پر ہوتا ہے۔ ہمارا نیا ادبی ماحول ۱۹۴۷ء کے ساتھ ہی وضع ہونا شروع ہو گیا تھا۔ تقسیم سے قبل ادب کے جو رویے پوری شدت کے ساتھ کسی سفر میں تھے وہ پاکستان کی فضا میں ایک نئی صورت حال سے ہمکنار ہوئے۔ فسادات تو خیر ایک موضوع تھا ہی، مگر بڑا موضوع آزادی کے اثرات نئی امنگوں، آرزوؤں کے ساتھ "شب گزیدہ سحر" کی پھبتی بھی تھی۔ ۱۹۵۸ء کے مارشل لاء نے ایک کاری ضرب لگائی۔ قیام پاکستان سے وابستہ خوابوں کی شکستگی کا عمل تو پہلے ہی شروع ہو گیا تھا اب مارشل لاء کا دیا ہوا غیر جمہوری کلچر، نئی صنعتیں اور معاشرتی مسائل کو ناولوں میں بڑھ چڑھ کر بیان کیا جانے لگا۔

پاکستان کی تشکیل کے فوراً بعد قرۃ العین حیدر کے دو ناول "میرے بھی صنم خانے" اور "سفینہ غم دل" میں فکری مباحث، داخلی خود کلامی وقت کی حد بندی میں اُتھل پتھل اور تقسیم ہند سے متعلق ماجرا اور داخلی کرب مل کر

ایک ایسے اسلوب کی تشکیل کرتے ہیں جس میں دلچسپی اخیر تک قائم رہتی ہے ان کے یہاں ناسٹلجیا کا احساس تقسیم ہند کے نتیجے میں کلچر کی ٹوٹ پھوٹ اور صدیوں سے جمی جمائی زندگی کی شکستگی، خوف، اندیشوں، وسوسوں کے زیر اثر موت کا حواش پر طاری ہونا اور وقت کے ایک بھیانک کردار کا روپ دھار لینا ایسے موضوعات تھے جو بعد میں آنے والے ناولوں کا اثاثہ بنے۔

قیام پاکستان کے بعد جن ناولوں میں ناسٹلجیا کی پیشکش ملتی ہے ان میں عزیز احمد کا ناول ایسی بلندی ایسی پستی ہے اس ناول میں طبقہ امراء کے گھر، کلب پارٹیوں، ضیافتوں، معاشقوں، ناجازئ جنسی تعلقات، باہمی رقابتوں، اشرافیہی کی پوری زندگی کو اس انداز سے پیش کیا ہے کہ پورا معاشرہ قاری جی نظر کے سامنے آجاتا ہے۔

شوکت صدیقی کا خدا کی بستی معاشرے کی تشکیل کی حقیقی تصویر ہے۔ عبداللہ حسین کا اداس نسلیں حقیقت میں ہماری موجودہ نسل کی ہی داستان ہے کیونکہ یہ نسل بھی سکون سے عاری ہے۔ اداس نسلیں میں گاؤں کے باشندوں کی تکلیف دہ زندگی کا ذکر ہے جو جان توڑ محنت اور فطرت و سماج کی اندھی قوتوں کے سامنے سینہ سپر ہیں۔

خدیجہ مستور کا ناول "زمین" قیام پاکستان کے بعد مہاجرین کیمپ سے شروع ہوتا ہے۔ ناول میں آزادی کے بعد کی سیاسی، معاشی اور معاشرتی اور تہذیبی کشمکش کی داستان کو بیان کیا گیا ہے جہاں انسان اپنے ماضی میں کیے گئے عہد کو بھول کر دولت اور کھوکھلی عزت سمیٹنے میں مصروف ہے اور کھوکھلے معاشرہ کو جنم دے رہا ہے۔

تقسیم ہند برصغیر کی تاریخ کا ایک ایسا واقعہ ہے جس نے انسان کی تقدیریں بدل کر رکھ دیں۔ آزادی کی تحریک میں لوگ مارے گئے اور ایسے روح فرسا مناظر دیکھنے میں آئے، جن کو یاد کر کے آج بھی حیرت ہوتی ہے۔

پاکستان چونکہ مارشل لاء کی زد میں رہا ہے اس لیے پاکستانی تخلیق ادیب کو اپنے ملک میں بہت کم جمہوری ماحول میسر آیا اسی لیے ہمارا بیشتر ادب سیاسی مزاج کا حامل ہے۔ ۱۹۵۶ء کا مارشل لاء جب ختم ہوا تو وہ ایک ایسا عہد میں داخل ہوئے جہاں خارجی حقائق اپنی اصل صورت کے ساتھ واضح دکھائی دینے لگے۔

سقوط ڈھاکہ کا واقعہ پاکستان کی سیاسی، سماجی زندگی کا ایک ناقابل فراموش واقعہ ہے۔ اس سانحے کو بہت سے ادیبوں نے ادب کا موضوع بنایا۔ سقوط ڈھاکہ پر لکھا گیا سلمیٰ اعوان کا ناول "تنہا" ہے۔ بنگلہ دیش کے قیام کے نتیجے میں جو عظیم انسانی المیہ رونما ہوا اس کے حوالے سے رضیہ فصیح احمد کا ناول "صدیوں کی زنجیر" اپنی منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ جس میں تقسیم ہند سے متعلقہ انسانی ٹریجڈی ہے یعنی سیاسی اُتھل پتھل کے بطن سے فسادات کا پھوٹ پڑنا، انسان کا انسان سے بربریت والا سلوک کرنا، ہزاروں لاکھوں جانوں کا ضیاع، ہجرت، ناسٹلجیا، منفی اقدار کی تشکیل اور نئی مٹی

میں پرانی جڑوں کا اتصال کرنا، یہ تمام عناصر ناسٹلجیا کو جنم دیتے ہیں۔

نمایاں ناول:

اردو ناول میں اگر ناسٹلجیائی رجحان کو دیکھا جائے تو قیام پاکستان کے بعد جو دو بڑے ادیب سامنے آتے ہیں ان میں قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین کا ہے جنہوں نے ہندوستان کو دو لخت ہوتے دیکھا اور اس وقت کے کرب کو اپنی قریبی نگاہ سے دیکھا اور محسوس کیا۔ قرۃ العین حیدر نے جب اپنی تہذیب کی تلاش میں ماضی کا کھوج لگانا شروع کیا تو انہوں نے ہندوستان کی مخصوص ثقافت سے آگے ہند اسلامی کلچر کو پیش کیا۔ قرۃ العین حیدر کے فن کی یہ خوبی ہے کہ وہ ایک نقطہ کو پھیلا کر وسیع کینوس میں دیکھنے کی عادی ہیں۔ اس لیے وہ تہذیبوں اور قوموں کے بننے اور بگڑنے کے عمل کو ملحوظ رکھتے ہوئے، فرد کے ناسٹلجیا کا سراغ لگاتی ہیں۔

قرۃ العین حیدر کی ناول نگاری کا آغاز "میرے بھی صنم خانے" سے ہوتا ہے موضوع کے اعتبار سے ان کا دوسرا ناول "سفینہ غم دل" دراصل "میرے بھی صنم خانے" ہی کی توسیع ہے کیونکہ اس کا موضوع بھی تحریک آزادی، ملک کی تقسیم سے جنم لینے والے فسادات اور ہجرت کے تجربے ہیں۔ ناسٹلجیا کی فضا بھی انہی وجوہات کی بناء پر پیدا ہوتی ہے۔

پاک و ہند کی تقسیم کے نتیجے میں جو حوادث سامنے آئے انہوں نے ناسٹلجیا کی ایک شدید احساس کو جنم دیا جس کا تحریری اظہار ہمارے یہاں ادیبوں اور شاعروں کے ہاں جابجا نظر آتا ہے۔

آگ کا دریا :

آگ کا دریا قرۃ العین حیدر کا ایک شاندار ناول ہے جسے اردو ناول نگاری میں خاص مقام و مرتبہ حاصل ہے۔ آگ کا دریا اپنے اندر متفرق موضوعات کو سمیٹے ہوئے ہے جس میں ایک عہد کی جھلکیاں، جنگیں، فسادات، سرحدوں کی تقسیم، غریب الوطنی، نسلی تعصبات، تہذیبوں کا تصادم، انسانی حقوق کا استحصال، مسئلہ جبر و قدر، تاریخ کی حشر سامانیاں اور مختلف فلسفیوں کی انسانی فکر و عمل پر اثرات سب نظر آتا ہے۔ ارضی پیوستگی انسانوں کیلئے جن الجھنوں کا باعث بنتی ہے۔ اس کی ایک صورت سرحدوں کی تقسیم ہے جس سے انسان دنیا میں کہیں نہ کہیں دوچار ہے۔ قرۃ العین حیدر کے ہاں ماضی سے پیوستگی کا احساس ایک زندہ طاقت کے طور پر موجود ہے ان کا ماضی کے ساتھ لگاؤ محض رسمی نہیں بلکہ ایک خاص ناسٹلجیائی کیفیت کی وجہ سے ہے جو تقسیم کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے ایک خاص ذہنی کیفیت اور ناسٹلجیا کے مارے ہوئے تارکِ وطن جنہیں سیاست اور تاریخ نے بانٹ دیا تھا اور جو سرحد کے دونوں اطراف موجود تھے ان کی ذہنی کیفیت کے مختلف زاویے قرۃ العین حیدر نے بڑے کرب انگیز اسلوب میں پیش کیے ہیں۔ آگ کا دریا کے

بعد جس ناول کو نہایت مقبولیت حاصل ہے اس کا تذکرہ بھی ناسٹلجیائی پس منظر میں کرنا ضروری ہے۔ عبداللہ حسین کے ناول اداس نسلیں میں بھی ناسٹلجیا کی واضح جھلک محسوس ہوتی ہے۔ اداس نسلیں میں پہلی بار برطانوی سامراج کی سازشوں، تحریک آزادی کے مختلف مرحلوں اور اس تحریک میں پنجاب کے گاؤں کے کسانوں نے حصہ لے کر جو قیمت ادا کی، اس کے اثرات کی وسیع پیمانے پر نشاندہی کی گئی ہے۔

اداس نسلیں:

اداس نسلیں میں عبداللہ حسین نے برصغیر کی تاریخ کے کئی ادوار کو درجہ بہ درجہ کھولا ہے اور یہ دکھایا ہے کہ یہ لمحہ بدلتی ہوئی زندگی شہر اور دیہات کے باسیوں کی نفسیات پر کس طرح اپنے نقوش چھوڑ جاتی ہے۔ عبداللہ حسین نے برصغیر کے ان پسماندہ انسانوں کی بے بسی اور لاچارگی کو پیش کیا ہے جن کو برطانوی غلامی اور افلاس نے نہایت شکستگی سے دوچار کر دیا تھا۔ برصغیر کی تقسیم جو کافی حد تک سامراجی سازش کا نتیجہ تھی ان کمزور انسانوں کی اداس نسلوں کیلئے مزید تباہی اور بدنصیبی لے کر آرہی تھی اور انسانی تاریخ ایک دردناک داستان کی علامت تھی۔ روایتی انداز کا یہ ناول تاریخی شعور کے ساتھ اس دور کے ہندوستان کی تصویر کشی کرتا ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر اس ناول کے بارے میں رقمطراز ہیں:

> عبداللہ حسین اور ان کا طویل ناول اداس نسلیں ایک عجوبہ سے کم نہیں، جس کی ایک سطر تک نہ چھپی تھی اور جو ہر لحاظ سے گم نام تھا حسین نے وسیع کینوس پر زندگی کا مشاہدہ کیا ہے۔[۱۳]

اداس نسلیں کا موضوع ایک فرد کا موضوع نہیں بلکہ ہم عصری زندگی کے مختلف ادوار اور ان سے گزرے ہوئے عمل اور صعوبت کے گرداب میں محور کم از کم تین نسلوں کے نمائندے ہیں۔ ناول کا تانا بانا انہی کے تجربات کے ارد گرد بنایا گیا ہے یہ عمل جس زمانے کا ہے وہ پہلی جنگ عظیم کا زمانہ ہے اور تقسیم ہند پر آشوب اور ہنگامہ خیز مدت تک پھیلا ہوا ہے یہ ہندوستان میں بسنے والی کئی نسلوں کی تاریخ کے بدلتے ہوئے ادوار کا مرقع ہے۔ اس میں مرکزی کردار نعیم اور عذرا ہیں، ذیلی کرداروں کو روشن آغا اور مسعود خاص طور پر اہم ہیں۔

اداس نسلیں میں ناسٹلجیائی کیفیت کے اثرات ملتے ہیں کیونکہ اس میں عبداللہ حسین بذات خود ناسٹلجیا کے اثر سے لکھنا شروع ہوئے جب انہیں تنہائی اور بوریت نے آگھیرا تھا۔

اداس نسلیں میں مختلف سطحوں پر اور مختلف معاشرتی گروہوں کے درمیان بے شمار افراد کے تشدد، بے راہ روی اور تند و تیز جذبات کے بے نقاب کیا گیا ہے ناول میں روشن پور اور روشن آغا سے متعلق افراد ہی تناؤ اور کشمکش کا شکار ہی نظر نہیں آتے بلکہ روشن آغا کی بیٹی عذرا، اور دوسری بیٹی بنتے بگڑتے رہتے ہیں پھر ملک کے سیاسی اتار چڑھاؤ

کے سبب بعض اوقات افراد کے تعلقات کے تانے بانے میں بھی پیچیدگیاں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ مرکزی کردار نعیم اور عذرا مختلف معاشروں اور ذہنی و جذباتی سروکار کے دو متضاد پہلوؤں کی نمائندگی کرتے ہیں اس کے باوجود ان کے درمیان عمل اور رد عمل کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے وہ دونوں اپنی جڑوں سے تو نہیں کٹ سکتے ہیں کیونکہ یہ جڑیں ان کی سائیکی میں پیوست ہیں۔

ناول کا مرکزی کردار نعیم جگہ جگہ اس معمول کا کام کرتا ہے کہ جن سے ماضی سے وابستہ یادیں گزرتی ہیں وہ ماضی کے پردوں کو بار بار اٹھا کر دیکھتا ہے اس کے دھندلکوں میں سے وہ نقوش نظر آتے ہیں جو کبھی جیتی جاگتی حقیقت تھے مگر اب وہ گرد آلود ہو گئے ہیں۔ ناول میں جب ہیرو کی ملاقات مہندر سنگھ سے ہوتی ہے تو وہ دونوں بیتے ہوئے لمحات کو دلوں میں اس طرح تازہ کرتے ہیں:

> گاڑی کی باتیں ختم ہو گئیں تو وہ خاموش ہو گئے۔ قبرستان میں تاریکی تھی اور سکون وہ دونوں چپ چاپ، ہاتھ پہ ہاتھ، سر جھکائے سیدھے تاریک راستوں پر آتے اور جاتے رہے۔ کبھی کبھی چند خشک پتے اور پھول ہوا کے زور سے ٹوٹ کر اینٹوں پر آ گرے اور ان کے پاؤں تلے چرچر کر ٹوٹ جاتے، کبھی وہ واپس آتے ہوئے پکا راستہ چھوڑ کر درختوں کے نیچے چلنے لگتے اور وہ پراسرار آواز بڑھ جاتی۔ سیاہ تنوں کے سامنے سے گزرتے ہوئے خوبانی کی جھکی ہوئی شاخیں۔ اندھیرے میں آہستگی سے ان کے بالوں اور آنکھوں پر گرتیں۔ اندھیرے سایہ دار راستوں پر جنتروں کے درمیان چپ چاپ چلتے ہوئے وہ پرانے زمانے کے دو بھوت معلوم ہو رہے تھے لیکن ان میں تم نے خون محسوس نہیں کیا؟ اپنے اندر یہاں اسی نے پسینے پر ہاتھ رکھا۔ کیا تم نے آسانی سے "، لیکن مہندر، تم اتنی آسانی سے قتل کر سکتے تھے، یاد ہے جب ہم۔ وہ اور بات تھی، ایک چوہا بھی اپنے بھائی کا اور اپنے خاندان کا بدلہ لے سکتا ہے یہاں پر بالکل دوسری بات ہے۔ [۱۴]

ناسٹلجیا کیفیات ناول میں جابجا بکھری پڑی ہیں نعیم جب طویل بیماری کے دوران میں اپنی گذشتہ شب و روز کا جائزہ لیتا ہے تو اس کے بے چین و مضطرب ذہن کی سطح پر جو نقوش ابھرتے ہیں وہ انہیں اس طرح بیان کرتا ہے:

> اس کے باوجود چند مٹتی ہوئی شکلیں کھڑکی کے اندھیرے اجالے میں دور دور تک ابھری ہوئی تھیں۔ کبھی کبھی وہ خوفناک حد تک قریب آ جائیں، ایک وہ ڈھلکا ہوا مونچھوں والا غلیظ، ستا ہوا مردہ چہرہ تھا، جس پر مدہم چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ ایک بوڑھے بیل کی طرح چلتا ہوا ہیولی تھا جو تاریک قبرستان میں اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا جبکہ خوبانی کے سفید شگوفے ان کے سروں پر گر رہے تھے اور ایک عجیب سا احساس ہوا، مگر وہ مرے ہوئے آدمی کے ساتھ چل رہا ہے۔ ایک غیر ملکی کا چہرہ تھا۔ جس کی سادہ، بے فن آنکھیں تھیں جو ایک چھوٹے جرمن گاؤں میں لکڑی کا کام کرتا تھا اور جس نے اپنی معصومیت میں ا

س پر اتنی دوستی اور رفاقت کا احسان عظیم کیا تھا اور اسے احساس ہوا تھا کہ وہ اگر اجنبی سب کچھ جانتا ہوتا تو وہ بھی یہی کرتا۔ مگر آخر اس سے کیا فرق پڑتا ہے اور ایک عذرا تھی جس کیلئے محبت کا جذبہ قریب قریب ناپید تھا لیکن جس نے اس کو احساس شکست بخشا تھا یہ عذرا کا نیا روپ تھا۔ ایک وقت آتا ہے جب ماضی کی چھوٹی سے چھوٹی بات ہمیں اداس کر دیتی ہے کوئی چہرہ، کوئی نام، کوئی لفظ، کوئی نظر، کوئی پرانی دھن جو ہم نے کسی غیر آباد گلی میں سے گزرتے ہوئے دور سنی تھی۔[15]

ناسٹلجیا عبداللہ حسین کی فکشن کا خاصہ ہے۔ غریب الوطنی عبداللہ حسین کا ذاتی کرب ہے۔ اپنے ایک انٹرویو میں ہجرتوں کو اپنا انتخاب قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں:

جی ہاں۔ میری ہجرتیں میرا انتخاب تھیں۔ اصل میں بات یہ ہے کہ جب سے میں نے ہوش سنبھالا۔ گویا پندرہ سولہ سال کی عمر سے میرے دل میں یہ کہ انسان ایک مستقل جلاوطنی کا عذاب سہہ رہا ہے۔ اس جلاوطنی کا جسمانی ہونا لازمی نہیں۔ اپنے وطن میں بھی لوگ بے وطن ہو جاتے ہیں یہ روحانی قسم کی جلاوطنی ہے یا شاید کوئی اور مناسب لفظ اس کیلئے ہوگا۔[16]

ڈاکٹر اعجاز راہی عبداللہ حسین کے ناول اداس نسلیں پر رائے دیتے ہوئے اپنے مضمون "پاکستان میں ناول" میں لکھتے ہیں:

اداس نسلیں فکری طور پر ایک کامیاب ناول ہے عبداللہ جس نے ناول کی تخلیق میں جس فکری رو موضوعاتی تشخص دیا ہے اس کا دائرہ نسلوں کی تاریخ و تہذیب کے جذباتی اور فکری تار و پود میں محض زف نگاہی کا وظیفہ نہیں اس المیہ کا محاکاتی استعارہ بھی ہے جو سیاسی، ثقافتی اور تہذیبی زوال کے تحت الشوری ادراک سے ہم آمیزی کرتا ہے۔[17]

ڈاکٹر اسلوب احمد انصاری اسی ناول پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

یہ کہنا بڑی حد تک صحیح ہوگا کہ عبداللہ حسین نے اپنے بے پناہ ہمہ گیر اور زرخیز تخیل کی گہرائیوں میں روحِ عصر یعنی Zeitgeist کو حیرت انگیز طور پر اسیر کر لیا ہے۔ مزید یہ کہ اس ناول میں نہ صرف کرداروں کی فراوانی اور ان کا متحرک وجود ملتا ہے۔ نہ صرف وہ سہل بے امال کی طرح اس کی وسعتوں میں چلتے پھرتے اور رواں دواں نظر آتے ہیں بلکہ فطری مظاہرہ کا ایک سیلاب جس میں چاند، سورج، ستارے، پہاڑ، ٹیلے چشمے اور آبشار اور زمین و آسمان کے ہر آن بدلتے ہوئے رنگ جو ایک محسوس حقیت کی حیثیت رکھتے ہیں ہمیں یہاں نظر آتا ہے۔[18]

انتظار حسین بار بار ماضی سے اپنے آپ کو کھوجتے ہیں اور ایک مخصوص انداز میں اپنی جڑوں کو تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ عہد گزشتہ کو ماضی و حال میں مجسم کرنے کی کوشش کرتے ہیں اس کی نمایاں مثالیں ان کے ناولوں ان کے ناولوں بستی اور آگے سمندر ہے میں ملتی ہیں۔

بستی انتظار حسین کا ایک جدت آمیز ناول ہے جس میں ناسٹلجیائی پیشکش واضح انداز میں نظر آتی ہے اس ناول میں انتظار حسین نے تکنیک، اسلوب اور ہیت سب کچھ ایک نئے رخ میں پیش کیا ہے اس میں داخلی خود کلامی بھی موجود ہے اس میں ڈائری بھی ماجرے کی پرتیں کھولتی ہے مگر اس کا اصل موضوع ہجرت کے المیے سے وابستہ ہے۔

انتظار حسین کے اس ناول کے کردار پرانے ماحول کو یاد کر کے کڑھتے ہیں۔ پرانی یادوں سے وابستہ اشیاء کو یاد کرتے رہنا ناول کے کرداروں کا خاصا ہے۔ گمشدہ پیڑ، پرندے، گمشدہ صورتیں، نیم موٹے ٹہنے پر پڑا ہوا جھولا، مکانوں پر ممٹیاں یہ سب ایسی یادگاریں ہیں جو افراد کو ایک کرب میں مبتلا کر دیتی ہیں ایسا کرب جو ہجرت کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے۔ بستی میں روپ نگر کو چھوڑ کر آنے کا جو پچھتاوا ہے اسے انتظار حسین اپنے ناول کے کردار ذاکر کے الفاظ میں یوں بیان کرتے ہیں کہ روپ نگر اور لاہور ایک ہو کر بستی بن گئے۔ انسانی فطرت کا خاصا ہے ک وہ پرانے ماحول، پرانی بستی اور پرانی جگہوں کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ ناسٹلجیائی یادیں ہجرت کرنے والوں کا حقیقی اور فطری سرمایہ ہوتی ہیں۔ انتظار حسین کے ہاں اسی سرمایہ کی فراوانی ہے۔ انتظار حسین کے دوسرے ناول "تذکرہ" میں بھی نئی جڑوں میں پیوست ہونے کی کوشش کا زبردست بیان ہے اس حوالے سے ممتاز احمد خان کا کہنا ہے:

> فہیم اعظمی کے ناول "جنم کنڈلی" جسے وہ خود تجرباتی ناول کے کرداروں سے آشکار ہوتے ہیں ان کا ناسٹلجیا انتظار حسین اور قرۃ العین حیدر کے ناسٹلجیا جیسا نہیں اعظمی کا ناسٹلجیا بے یقینی، تشکیک، ریشنلٹی، بے اعتمادی اور ہمہ گیر ناآسودگی کا شکار ہے اس کے برعکس انتظار حسین کے ہاں ناسٹلجیا کو نہایت قرینے سے پیش کیا گیا ہے۔[19]

جوگندر پال کے ناول "خواب رو" میں ناسٹلجیا ہجرت کے حوالے سے ملتا ہے جوگندر پال کے ہاں ہجرت کے بعد پیش آنے والے مسائل اور نئی آبادکاری کے مسائل کا تذکرہ ملتا ہے۔ جوگندر پال کا بیان ہے کہ ہجرت اور بے جڑی انسان مقدر ہے۔ اس ہجرت نے جو کرب دیا ہے وہ بھی انسان کا مقدر ہے۔ اس ہجرت جو کرب دیا ہے وہ بھی انسان کا مقدر ہے اس کرب کا ازالہ کرنے کی صورت یہی ہے کہ نئی سرزمین کو اپنا مسکن بنالیا جائے۔ کاغذی گھاٹ خالدہ حسین کا ناول ہے اس میں خود سوانحی رجحان اور ناسٹلجیا آپس میں گھل مل گئے ہیں۔ ناول ایک ایسی شائستہ، سنجیدہ اور حساس لڑکی کے گرد گھومتا ہے جو عام سے مڈل کلاس گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ سنجیدہ مزاج ادیبہ ہے جس کی سوچ ماضی کے گرد گھومتی ہے وہ اپنے سکول اور کالج وغیرہ میں اپنے ساتھیوں کو ناسٹلجیائی انداز میں یاد کرتی ہے۔ وہ اپنے

پرانے وقت کو یاد کرتی ہے اس کی اچھائیوں کو یاد کرتی ہے مگر تاریخ کے بھیانک واقعات کی شاکی ہے جنہوں نے انسانوں کو نقصان پہنچایا۔ وہ ایک طرف ناسٹلجیا کی شکار ہے تو دوسری طرف جدید عہد کی منافقتوں اور نئی مادیت پسند اقدار کی شاکی ہے۔ اپنے عالمانہ سطح کے ماحول میں اس کی مایوسی اور گہری ہو جاتی ہے۔ اس ناول میں ماضی سے جڑی یادوں، واقعات، پرانی اقدار اور اپنے گھر کے افراد کے رویوں کا ذکر ہے۔ ناسٹلجیا صرف اردو ناول تک ہی محدود نہیں بلکہ اس کی بازگشت ہمیں اضافہ، شاعری اور مزاح نگاری میں بھی ملتی ہے۔

اردو افسانے میں جن ادیبوں کے ہاں ناسٹلجیا پایا جاتا ہے ان میں قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، مسعود اشعر، رام لعل، امراؤ طارق، رام لعل، آغا اشرف، مظہر الاسلام، اختر جمال اور مسعود مفتی وغیرہ ہیں۔

مزاح نگاری میں اسی رجحان کی پیشکش بھی ملتی ہے اردو ادب کے ممتاز مزاح نگار مشتاق احمد یوسفی (جن کے کئی کردار ناسٹلجیائی عناصر لیے ہوئے ہیں اور اس کیفیت کو خود یوسفی صاحب کبھی یادش بخیر یا کبھی ماضی گیراں، کبھی یاد تمنائی کا نام دیتے ہیں) اس کو داستاں قسوں گری قرار دیتا ہے۔ ماضی کی پھول بھلیوں میں گم مستقبل کے خوف میں مبتلا اور حال کی بدحالی سے ڈرنے والے ان کرداروں کی کیفیت کو خود یوسفی صاحب ایک خوبصورت مثال دیتے ہیں جس کا بیان کچھ یوں ہے:

> ماضی گیراں (بروزن ماہی گیراں) ماضی کو پکڑ کر بیٹھ جانے والے لوگ تمنائی یا داستان طرازی کے پس منظر میں مجروح انا کا طاؤس رقص دینی ہوتا ہے۔ مور فقط اپنا ناچ ہی نہیں اپنا جنگل بھی خود پیدا کرتا ہے۔ ناچتے ناچتے ایک طلسماتی لمحہ ایسا آتا ہے کہ سارا جنگل ناچنے لگتا اور مور خاموش کھڑا دیکھتا رہ جاتا ہے۔[۲۰]

ناسٹلجیا اس لمحہ منجمد کی داستان ہے "مشتاق یوسفی کی کتاب "آب گم" میں ناسٹلجیا اس حد تک دکھائی دیتا ہے کہ وہ خود کہتے ہیں کہ اس مجموعے کے بیشتر کردار ماضی پرست ہیں اور انکا اصل مرض ناسٹلجیا ہے۔

ایسی بلندی ایسی پستی:

عزیز احمد کا شمار بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں ابھرنے والے جدید اردو ناول نگاروں میں ہوتا ہے اس دور کا ناول انسان کی زندگی اور اس سے جڑے مسائل کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ عزیز احمد کے ہاں اس عہد کے تمام تار چڑھاؤ کو واضح انداز میں دیکھا اور محسوس کیا جاسکتا ہے۔

چنانچہ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ناسٹلجیا ادب کی تقریباً ہر صنف میں ہی نظر آئے گا کیونکہ ناسٹلجیا ایک ایسی کیفیت ہے جس کو فراموش کرنا کسی بھی ادیب یا شاعر کے ہاں قابل قبول نہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ماضی کو

کبھی بھلا کر نہیں سکتا الغرض ناسٹلجیائی رجحان نہ صرف فکشن اور شاعری تک محدود رہا بلکہ یہ موضوع ڈراموں، فلموں میں بھی مقبول ہے۔

ایسی بلندی ایسی پستی ۱۹۴۷ء میں پہلی بار شائع ہوا اس ناول میں اعلیٰ طبقے کی نفسیات کو دیکھا یا گیا ہے۔ عزیز احمد اعلیٰ طبقے کی نفسیات کو بخوبی سمجھتے ہوئے ان اہم افراد کو سامنے لاتے ہیں جو اس زوال پذیر معاشرے کے افراد ہے۔ جہاں سکون و قلب چھین کر اذیت اور بے چینی کو ہمارا مقدر بنا دیا گیا ہے۔ عزیز احمد نے ایک تہذیبی المیے کو فرد کی کج روی کے ذریعے بیان کیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے نام نہاد اخلاقی تصورات اس کو ریاکاری کی سطح پر لے آتے ہیں یہاں سے انسانیت اور تہذیبوں کا زوال شروع ہوتا ہے اویہی چیز ناسٹلجیا کا باعث بنتی ہے۔ اخلاقی اقدار کو جب زوال آتا ہے تو ناسٹلجیا کا جنم لینا ایک فطری عمل ہے۔

پروفیسر حسن عسکری کو یہ ناول ہر لحاظ سے پسند تھا کہ انہوں نے کہا تھا:

> ایسی بلندی ایسی پستی صرف چند افراد کی داستان نہیں بلکہ ساتھ ساتھ ایک طبقے کی کہانی ہے غالباً یہ اردو میں پہلا اجتماعی ناول ہے اور اردو میں ایک نیا تجربہ ہے۔ حیدر آباد دکن کے امیر طبقے کی تصویر اس سے پہلے بھی اتنی کامیابی سے پیش نہیں کی گئی۔[۱۲]

حسن عسکری کا اس ناول کو خراج تحسین اس بناء پر تھا کہ اس میں عزیز احمد نے اس اجتماعی زندگی کا آئینہ پیش کیا تھا جس کا تعلق حیدر آباد دکن کی تہذیب سے تھا جو زوال سے ہمکنار ہو رہی تھی۔

ناول کا آغاز حیدر آباد دکن میں کشن پی کی پہاڑیوں کے دلکش مناظر سے ہوتا ہے ناول کے کرداروں کا تعلق اعلیٰ طبقے سے ہے نور جہاں ناول مرکزی کردار ہے۔ ذی جاہ جنگ نور جہاں کا باپ ہے۔ نور جہاں کی چار بہنیں اور ایک بھائی ہے۔ نور جہاں کی پہلی بھابھی وفات پا چکی ہے اور وہ ایک انگریز سے دوسری شادی کر لیتا ہے۔ اس انگریز بیوی کا نام سکندر زمانی ہے یہ بچوں سے بہت پیار کرتی ہے اسے خاندانی شان و شوکت کا بڑا فکر ہوتا ہے اور خاندانی عزت و توقیر کو وہ اولیت دیتی ہے۔

ناول کا سارا ماحول شاہی خاندان سے تعلق رکھتا ہے عزیز احمد نے اس دور کی چمک دھمک اور زندگی کی بہاروں کو دکھایا ہے اس کے ساتھ عزیز احمد وقت کا شعور بھی رکھتے ہیں اور اپنے عہد کے قومی و بین الاقوامی حالات، دنیا کی ترقی اور اس میں ہونے والی سیاسی و سماجی تبدیلیوں، سرمایہ دارانہ نظام اور دوسری جنگ عظیم کی تباہ کاریوں کا تذکرہ ایسے مخصوص انداز میں کرتے ہیں کہ ناول اپنے موضوع کے ساتھ اپنے عہد کی تاریخی دستاویز بن جاتا ہے۔

نور جہاں اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے جس کی شادی سلطان حسین سے کر دی گئی ہے جو شراب و شباب، مخلوط مجلس اور نہایت عیاش پرست انسان ہے۔ سلطان حسین اپنی بیوی کی بجائے غیر عورتوں کے ساتھ وقت گزارتا ہے۔ نو بیاہتا

شوہر کی بے وفائی کا چشم خود نظارہ کرتی ہے اور فطری طور پر ایک شدید صدمے سے دوچار ہوتی ہے۔ نور جہاں ایک مقبول صورت، مہذب اور نارمل احساسات رکھنے والی پرکشش جوان عورت ہے وہ خود سپرگی کے جذبے سے سرشار ہے اور ایسی ہی توقع اپنے شوہر سے رکھتی ہے لیکن سلطان اس کے برعکس اپنے ماضی سے رشتہ منقطع نہیں کرنا چاہتا جس کی وجہ سے ان کے درمیان آئے روز جھگڑے ہوتے رہتے ہیں۔

> چُپ حرامزادی، سلطان حسین نے منیر پر اس زور سے بھینچی ہوئی مٹی ماری کہ پیالی سے چھلک کے چائے پالش کی ہوئی میز پر پڑی۔ ایک داغ سا پڑ گیا۔ تو ہو گا حرامزادہ، ذرا زبان سنبھال کے بات کر مجھ کو اپنی لونڈی سمجھ لیا ہے۔ خود تو چھٹا ہوا آوارہ بدمعاش ہے اور الٹا ہر وقت میری جان کے پیچھے پڑا رہتا ہے۔[۲۲]

آخر کار ان دونوں کی لڑائی جھگڑے کا انجام خلع ہوتی ہے۔ کرداروں کے یہ مکالمے اور ان کی زبان حیدر آباد کدن کی زوال پذیر سوسائٹی کی گفتگو کو آشکار کرتی ہے جو گھروں میں بولی جاتی ہے لیکن اس سوسائٹی کی منافقت ایسی ہے کہ کلبوں اور مخلوط محفلوں میں یہ طبقہ اپنے آپ کو اعلیٰ تہذیبی قدروں سے معمور ظاہر کرتا ہے۔

ناول میں بے شمار ذیلی کردار ہیں لیکن ناول کا مرکز و محور سلطان حسین اور نور جہاں ہی ہیں۔ ناول میں سیاسی، سماجی و مغربی تہذیب و ثقافت کی قدروں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ سلطان اور نور جہاں میں علیحدگی کی کچھ مدت گزرنے پر نور جہاں کے اندرون میں خوابیدہ جذبات انگڑائی لیتے ہیں۔ نور جہاں کی پرانی محبت جو اس کے تحت الشعور میں کہیں دفن ہو گئی تھی۔ دوبارہ جاگ اٹھتی ہے۔ گزرا ہوا وقت ایک بار پھر انگڑائی لیتا ہے ی۔ اظہر نور جہاں کی بھولی بسری محبت جسے اطہر کی چالاک نظروں نے گھائل کر دیا تھا لیکن نور جہاں نے کسی موقع پر بھی اپنی عصمت کو داغ دار نہیں ہونے دیا۔ وہ آسانی سے کسی کی نظر کی اسیر نہیں ہوتی تھی لیکن سلطان حسین کے بے حسی نے اسے محبت سے محروم رکھا ہوا تھا چنانچہ نور جہاں سرکشی پر مائل ہو جاتی ہے۔

اطہر کبھی بھی عورتوں کیلئے نیک نام نہیں رہا لیکن نور جہاں کیلئے وہ اپ نے دل میں ایک نرم گوشہ رکھتا ہے یہی وجہ دونوں میں پاکیزہ رشتہ ازدواج کے قائم ہونے کا سبب بنتا ہے۔

> عین اس وقت قضائے صبر م نے نور جہاں کی آنکھیں اس کی آنکھوں سے چار کرادیں۔ محض اتفاقاً لیکن معلوم ہوتا تھا کہ ان کی آنکھوں کے درمیان بجلی کی رو دوڑ گئی۔ شاید اسی کو اردو محاورے میں آنکھ لڑانا کہتے ہیں۔ یہ وہی نور جہاں تھی، جو اس کے ساتھ کھیلی ہوئی تھی اور جسے وہ بچپن میں جب بھی پیچ گنی سے آتی، بہت ستایا کرتا تھا اب وہ مورت تھی اور کسی کی بیوی، کتنی عجیب بات تھی، کتنی مہمل۔[۲۳]

اطہر سے نور جہاں کے منسلک اور وابستہ ہو جانے میں اسے بہت عرصہ لگا بہت سی مشکلات، تکلیفیں اور حسرتوں بھرے دور سے گزرنا پڑا۔ سلطان حسین بھی دوسری شادی خدیجہ نامی عورت سے کر لیتا ہے۔ لیکن خدیجہ اور نور جہاں میں بہت فرق ہے۔ خدیجہ سرتاپا عجز و نیازی اور خود سپردگی کا پیکر ہے۔ وہ ایک اوسط درجے کی دل و دماغ کی گھریلو قسم کی عورت ہے۔ اس کی زندگی کا مقصد شوہر کی رضا جوئی اور خدمت ہے۔ جب کہ نور جہاں کے ہاں جذبات تیز اور تلخ ہیں۔ اس کے ہاں خدیجہ جیسا نرم ملائم دل اور غیر معمولی قسم کا ممالیاتی ذوق بھی نہیں۔ وہ بار بار اس کی گردان کو پیار کرتی جاتی، اس گرد نیائے قربان ہو جاؤں، مجھے تمہاری گردن بڑی پیاری معلوم ہوتی ہے اور اسلطان حسین مذاق میں کہتا کہ تو پھر کاٹ کر مرتبان میں رکھ لو۔

سلطان حسین اور نور جہاں کے درمیان علیحدگی کے بعد دونوں کی اتفاقیہ ملاقات ابوالہاشم کے گھر ہوتی ہے۔ جہاں وہ تفریت کرنے جاتے ہیں اس موقعہ پر گزرے لمحوں کی یاد کو عزیز احمد نے ناول میں اس طرح بیان کیا ہے:

> ایک منٹ کیلئے سلطان حسین اور نور جہاں کی آنکھیں، بجلی کی بے رونق لہر جس سے اجالا نہیں ہوتا، نفرت کے بغیر کسی قسم کے احساس کے بغیر، محبت کے بغیر سب خواب معلوم ہوتا تھا۔ سب بے اصل، سلطان حسین، مشہور النساء ابوالہاشم، کسی کے گھر کی کوئی بنیاد نہیں، کسی کشتی کا کوئی لنگر نہیں۔ سب بے ربط، بے حقیقت، خواب کی طرح۔[۲۴]

ناول کے اختتام پر سلطان حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال کر جاتا ہے تو اس موقع پر نور جہاں کو اس کے ساتھ گزرے دن یاد آتے ہیں۔ ناول جدید تکنیک کے اصولوں کو ملحوظ رکھ کر لکھے گئے ہیں اور زندگی کا حقیقت پسندانہ تجزیہ کیا گیا ہے۔ عزیز احمد کردار نگاری میں انسانی نفسیات کے پیچ و خم کی تصویر کشی کرتے ہیں، اس لیے زندہ کردار تخلیق کرنے پر قادر رہی۔

ڈاکٹر خالد اشرف اس ناول سے متعلق رقمطراز ہیں:

> عزیز احمد نے ایسی بلندی ایسی پستی ۱۹۴۸ء میں آزادی سے پہلے کے حیدر آباد کے رئیسوں کی عیاشیوں، جنسی کج کے رویوں اور عوام الناس کے مسائل سے ان کی بے حسی کو موضوع بنایا ہے۔ انہوں نے ریاست میں ہونے والی معاشرتی تبدیلیوں کو پیش کر کے اس زندگی کے خلفشار کو ظاہر کیا ہے۔ جو نہ پوری طرح مشرقی تہذیب و مزاج کو چھوڑ پاتی تھی اور نہ ہی مغربی تہذیب کو اپنا سکی تھی۔ عزیز احمد نے متوسط طبقے اور اصراور سا کو موضوع بنایا ہے ان کی انحطاط پسندی اور مریضانہ عیش پرستی پر زور دیا ہے۔[۲۵]

ڈاکٹر انور احمد، عزیز احمد کے فن کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

عزیز احمد کے آخری برسوں میں مسلم ثقافت کے موضوع پر بیش قیمت کام کیا۔ میرے خیال میں اس کام نے ان کو قوت متخیلہ، افسانوی حیات، اور فنی رویے کو بھی متاثر کیا۔ وہ حکایت کے سہارے ماضی کے کھنڈرات کو کریدنے کا تہیہ نہیں کرتے بلکہ تاریخ، علم انسان، نسلیات، فنون لطیفہ اور تمدن کی سرچ لائٹ سے ماضی کے اندھے کنویں میں اترتے ہیں اور نہایت دل آویز کہانیاں لے کر برآمد ہوتے ہیں۔[۲۶]

انتظار حسین ماضی پرستی کے حوالے سے ایک اہم شخصیت ہیں وہ بار بار ماضی سے اپنے آپ کو کھوجتے ہیں اور عہد گذشتہ کو ماضی و حال میں مجسم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انتظار حسین کے نزدیک فرد مجموعہ ہے اس کی یادوں اور یادیں ثمر ہیں۔ ماضی کا اس لیے انتظار حسین ماضی کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا اور بار بار ناسٹلجیا کا شکار ہوتا ہے لیکن انتظار حسین جب ماضی کو یاد کرتا ہے تو محض وہ ماضی پرستی نہیں ہوتی بلکہ ماضی کے حوالے سے وہ ان تہذیبی اقدار کا ماتم کرتا ہے جنہیں جدید تہذیب اور ٹیکنالوجی نے ختم کر دیا ہے۔

انتظار حسین کے افسانوں میں نہ صرف ناسٹلجیائی کیفیات دیکھنے میں ملتی ہیں بلکہ ان کے ناول بھی ماضی کی نوحہ خوانی کرتے محسوس ہوتے ہیں۔ اس کی واضح مثالیں انکے ناولوں تذکرہ اور بستی میں ملتی ہیں۔

بستی انتظار حسین کا ایک شاہکار ناول ہے جس میں ناسٹلجیائی پیشکش واضح انداز میں محسوس کی جاتی ہے اس ناول میں انتظار حسین نے تکنیک، اسلوب اور بہت سب کچھ ایک نئے رُخ میں پیش کیا ہے۔ انتظار حسین کو بالعموم قنوطی کہا جاتا ہے لیکن بستی میں اس کا زاویہ نگاہ بدلا نظر آتا ہے کہ اس نے آخر میں نئی رت کی بشارت بھی دی ہے۔ انتظار حسین کی بستی پر ایک اعتراض ناول کی تکنیک سے عدم توجہی کا بھی ہے ہمیں انتظار حسین کی جرات کی داد دینی چاہیے کہ اس نے ناول کی تکنیک کے اس فارمولے کو توڑ کر ناول لکھنے کی کوشش کی ہے جو مروجہ اصولوں سے انحراف کرتی ہے اس میں داخلی خود کلامی بھی موجود ہے۔ ڈائری کے ماجرے کی پرتیں کھلتی ہے مگر اس کا اصل موضوع ہجرت کے المیے سے وابستہ ہے۔

بستی:

انتظار حسین کی بستی بے جڑ لوگوں سے آباد ہے اس لیے وہ سب بے یقینی، لاتعلقی، تشکیک اور ناسٹلجیا کے مریض ہیں۔ بزرگوں کی نسل کا ماضی، ان کے شجرہ نسب، بوسیدہ مخطوطوں، دیمک لگے پرانے ورقعوں والی کتابوں، پرانے ورقعوں، پرچوں، نسخوں، دعاؤں، تعویذوں اور چابیوں کی صورت میں ہے۔ نئے ملک اور بدلے ہوئے

حالات میں یہ اشیاء بے کار تو ثابت ہو سکتی ہیں لیکن بے معنی نہیں کہ یہ ماضی کے استعارے ہیں۔ جبھی تو چابیوں کے بارے میں باپ فخریہ کہہ سکتا ہے:

"ہم نے تو انہیں زنگ لگنے نہیں دیا" آگے ذاکر میاں جانیں، اور ماں کہتی ہے "ہاں بیٹے یہ بات دادا کی امانت ہے اسے حفاظت سے رکھنا"۔

باپ دادا کی امانت "وہ بڑبڑایا" بیٹے یہ اس گھر کی چابیاں ہیں جس پر اب تمہارا کوئی حق نہیں ہے۔ اس گھر کی اور اس روپ نگر کی۔ اس گھر کی اور اس زمین کی روپ نگر کی چابیاں۔ چابیاں کہاں میرے پاس ہیں اور وہاں ایک پورا زمانہ بند ہے۔ گزرا زمانہ مگر زمانہ گزرتا کہاں ہے، گزر جاتا ہے، پر نہیں گزرتا، پاس منڈلاتا رہتا ہے۔[۲۷]

بستی میں "شجر" اور "قبر" کے حوالے سے ماضی کو جس طرح یاد کیا گیا ہے اس سے قبل انتظار حسین اسی موضوع پر ایک افسانہ "ہندوستان سے ایک خط" میں قلمبند کر چکا ہے۔ اپنے مزاج اور اسلوب کے لحاظ سے یہ افسانہ بستی کا ایک باب معلوم ہوتا ہے چنانچہ بستی کی قبر کی مانند اس افسانہ میں بزرگوں کی قبروں اور حویلیوں کے ساتھ ساتھ کٹے درختوں کا ماتم کیا گیا ہے۔ خاندان ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش میں منقسم ہو جاتا ہے۔ افسانہ "ہندوستان سے ایک خط" کی اہمیت اس تیز طنز میں پوشیدہ ہے جو انتظار حسین نے پاکستانیوں کیلئے بطور خاص رکھا ہے حتیٰ کہ بنگلہ دیش بننے پر وہاں فرار ہو کر آنے والا پاکستانی دلی میں بھارتی فلمیں بھی دیکھتا ہے۔ الغرض یوں محسوس ہوتا ہے کہ گویا یہ افسانہ بستی کا ابتدائی خاکہ ہو یا پھر ہو سکتا ہے کہ "ہندوستان سے ایک خط" لکھنے کے بعد اس موضوع سے وابستہ وسیع امکانات کے باعث ہی بستی لکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی ہو۔ وجہ جو کچھ بھی ہو بستی اور ہندوستان سے ایک خط کا تقابلی مطالعہ ایک دلچسپ نتائج کا حامل ہو سکتا ہے۔

انتظار حسین کے ناول بستی میں جابجا ماضی کی یادیں پائی جاتی ہیں بستی میں ذاکر کے باپ کی گفتگو کچھ یوں محسوس ہوتی ہے۔

اب میں ہوا میں اُڑتے پتوں کا ماتم دار ہوں ان دنوں کو جب یہ خاندان برگ و ثمر سے لدا پھندا درخت تھا یاد کرتا ہوں اور آوارہ پتوں کا شمار کرتا ہوں۔[۲۸]

بستی اس زمین کا ناول ہے جس سے ماں کی گود جیسی کشادگی اور محبوبہ کی آغوش جیسی نرمی کی توقع میں جڑ سے اکھڑے پودے تناور درخت بننے کی تمنا لیے آے۔ انتظار حسین کے سب کردار ناسٹلجیائی کیفیت میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ ناول میں انتظار حسین کے بوڑھے کردار کے الفاظ کچھ یوں ہیں کہ ماضی کا نوحہ کرتے معلوم ہوتے ہیں:

میں جب گھر سے چلا تھا تو میرے سارے بال سیاہ تھے اس وقت میری عمر ہی کیا تھا بیس اکیس کے پیٹے میں تھا۔ جب پاکستان پہنچا اور نہانے کے بعد آئینہ دیکھا تو میرے سر کے سارے بال سفید ہو چکے تھے یہ پاکستان میں میرا پہلا دن تھا۔[۲۹]

انتظار حسین کے ہاں ماضی کو دہرانے کی خواہش پائی جاتی ہے ان کی کہانیوں میں موجودہ دور کی افسردگی، بے دلی، کشمکش اور ماضی کی یادوں سے مداوا کرنے کی کوشش نظر آتی ہے جو کہ ایک ناسٹلجیائی عنصر ہے۔

انتظار حسین کے زیادہ تر کردار مخالف حالات میں خوفزدہ ہو جاتے ہیں اور ان کے اندر عدم تحفظ کا احساس جڑ پکڑنے لگتا ہے ی۔ انسانوں کے ذریعے انسانوں پر ڈھائے گئے ظلم، بربریت، بہیمانہ قتل وغارت گری یہ سب دیکھ کر انسانیت کانپ اٹھتی ہے اور ناول نگار کا دل رونے لگتا ہے۔

روپ نگر میں کیا کچھ رہ گیا تھا۔ کچے پکے رستے جو جانے کہاں جا کر نکلتے تھے۔ بس درختوں میں گم ہوتے دکھائی دیتے تھے۔ دولتے ہج کولے کھاتے اکّے، اونگتی رینگتی ریل گاڑیاں، کوئی کوئی رتھ کر اس میں جتے توانا بیلوں کی گردن میں آویزاں گھنٹوں اور گھنگروؤں کی بدولت وہ مٹی میں اٹے رستے ایک میٹھے شور سے بھر جاتے، کالا مندر، کالے مندر کے احاطے میں کھڑا بندروں سے آباد بڑا پیپل، کربلا کی اداس اور ویران فصیل، ٹیلے والا قلعہ، راون ون، راون ون، کے بیچ کھڑا بھید بھر برگربس، پورا ہیک دیو مالائی عہد تھا جو روپ نگر کے ساتھ رہ گیا۔[۳۰]

انسان ہجرت کر کے جب نئی جگہ جاتا ہے تو سب سے بڑا مسئلہ وہاں ایڈجسٹ کرنے کا ہوتا ہے نئے سماج اور نئے معاشرے میں خود کو ایڈجسٹ کرنے میں اسے وقت لگتا ہے۔ وہاں کے قانون وضوابط، اصول مختلف ہوتے ہیں۔ رہن سہن، رسم ورواج علیحدہ ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود انسان وہاں خود ایڈجسٹ کر ہی لیتا ہے۔

بہت بڑی غلطی ہو گئی" ٹھنڈا سانس بھرا، "زندگی میں ٹھوکریں لگی تھیں۔ مرتے گرتے یہاں آئے۔ کراچی میں خراب ہو رہے ہیں اولاد امریکہ میں، ہم کراچی میں، دل شکار پور میں، روح کربلا میں، بس دبدا میں ہوں مجو بھیا۔

"جی"

سچ مچ بتاؤں میں واقعی دبلا میں ہوں، بس شکار پور اور کربلا کے درمیان لٹکا ہوا ہوں۔ مٹی اپنی طرف کھینچتی ہے، ایمان اپنی طرف، روح کہتی ہے اس اجڑی بستی میں کیا رکھا ہے، ادھر تو جنت کی کھڑکی کھلی، تو ایک طرف مٹی دوسری طرف، سخت مشکل میں ہوں، کربلائی صاحب چپ ہو گئے۔[۳۱]

ہجرت کرنے والے اپنے پیچھے صرف اپنا وطن ہی نہیں بلکہ ایک ہری بھری کائنات چھوڑ جاتے ہیں:

یار مجھے لگتا ہے کہ جیسے ان میں کوئی چیز گم ہو گئی ہو، "جو بھیا ہنستے "کوئی چیز کی بات کرتے ہو استاد یہ تو پورے کے پورے گم ہو گئے ہیں۔ ان کی تو کایا پلٹ چکی ہے۔ اب یہ نہ خالص کراچی والے ہیں، اور جو یہ ہمارا لکھنو، ہماری دلی کرتے ہیں، مجبوری ہے "بقول شاہد خان وہاب یہی وجہ ہے کہ انتظار حسین کے کردار کو یادوں سے سفر نہیں۔ یادر کھ بھرے تجربوں خی ہو یا خوشگوار لمحوں کی ہمیشہ درد انگیز ہوتی ہے کہ بالآخر خالی پن اور محرومی ہی کو کھ سے سر ابھارتی ہے۔ [۳۲]

ان یادوں کی وجہ سے ان کے ناولوں میں درد کسک کی زیریں لہریں ہمہ وقت جاری و ساری رہتی ہیں اور دکھ و کرب کا ایک وسیع نامہ بن کر قاری کو پانی گرفت میں لے لیتی ہیں۔ ابھی تک ہم مہاجرین کے جن کوائف و مسائل کا تجزیہ کر رہے تھے کیا وہ ہجرت کے فوراً بعد ہی شروع ہو جاتے ہیں؟ شاید ایس نہیں، ہجرت کے بعد تو مہاجر آبادی اپنے کو معاشی اعتبار سے خود مختار اور سماجی اعتبار سے قابل قبول بنانے کی تگ و دو میں لگ جاتی ہے۔ ہندوستان سے پاکستان جانے والے زیادہ تر افراد و خاندان اپنی رضا سے پاکستان گئے تھے کہ وہ "اللہ میاں "پچھواڑا تھا" لیکن قیام پاکستان کے بعد وہاں کا معاشرہ کبھی بھی سکون اور ترقی کے پانچ دس سال نہیں گزار پایا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ انتظار حسین کے ناولوں کا زمانہ عہد عموماً پاکستان کے بحرانی دور سے معنون ہے۔

حوالہ جات

۱۔ صاحبزادہ عبدالرسول، تاریخ پاکستان (لاہور: اردو بازار آکسفورڈ اینڈ کیمبرج پریس، س۔ن)، ص ۲۶۰۔

۲۔ محمد ذاکر، آزادی کے بعد ہندوستان کا ادب (نئی دہلی: مکتبہ جامع، ۱۹۸۱ء) ص ۶۹۔

۳۔ قرۃ العین حیدر، میرے بھی صنم خانے (لاہور: مکتبہ جدید، ۱۹۴۹ء) ص ۴۱۹۔

۴۔ ایضاً، سفینہ غم دل (لاہور: مکتبہ جدید، ۱۹۴۹ء) ص ۲۹۹۔

۵۔ شاہد احمد دہلوی، "دلی سے لاہور تک" مشمولہ نصرت (جولائی ۱۹۵۹ء)، ص ۹۷۔

۶۔ حاجی شیخ معین الدین، "اللہ اللہ کر کے آزادی کی صبح طلوع ہوئی" مشمولہ نصرت (اگست ۱۹۹۹ء)، ص ۳۷۔

۷۔ عبداللہ حسین، اداس نسلیں (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء)، ص ۵۹۳۔

۸۔ انتظار حسین، آگے سمندر ہے (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۰ء)، ص ۱۱۴۔

۹۔ شوکت صدیقی، خدا کی بستی (کراچی: مکتبہ نیا راہی، ۱۹۶۲ء)، ص ۲۶۶۔

۱۰۔ انتظار حسین، بستی (لاہور: کتاب گھر، ۱۹۷۹ء)، ص ۲۲۱۔

۱۱۔ قرۃ العین حیدر، میرے بھی صنم خانے (لاہور: مکتبہ جدید، ۱۹۴۹ء)، ص ۴۱۹۔

۱۲۔ عبداللہ حسین، اداس نسلیں (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۶ء)، ص۔ ۱۲۵۔۱۲۷۔

۱۳۔ ایضاً، ص ۵۳۷۔

۱۴۔ ایضاً، ص ۴۶۵۔

۱۵۔ محمد عاصم بٹ، عبد اللہ حسین: شخصیت اور فن (اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان سنہ)، ص ۱۳۷۔۱۳۹۔

۱۶۔ عبداللہ حسین، اداس نسلیں (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۶ء)، ص ۳۷۵۔

۱۷۔ اعجاز راہی، "پاکستان میں ناول" مشمولہ "، "اظہار" (راولپنڈی دستاویز پبلیشرز ۱۹۴۷ء)، ص ۱۸۔

۱۸۔ اسلوب احمد انصاری، اردو کے پندرہ ناول (علی گڑھ: یونیورسل بک ہاؤس، ۲۰۰۳ء)، ص ۲۳۲۔

۱۹۔ مشتاق احمد یوسفی، آب گم (کراچی: مکتبہ دانیال، ۲۰۰۵ء)، ص ۲۰۔

۲۰۔ عزیز احمد، ایسی بلندی ایسی پستی (لاہور: مکتبہ جدید، ۱۹۴۷ء)، ص ۱۸۸۔

۲۱۔ ایضاً، ص ۱۷۱۔

۲۲۔ ایضاً، ص ۳۵۴۔۳۵۵۔

۲۳۔ ایضاً، ص ۲۳۳۔

۲۴۔ ایضاً، ۲۴۱۔۲۴۲۔

۲۵۔ خالد اشرف، برصغیر میں اردو ناول (لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۰۵ء) ص ۲۵۰۔۲۵۱۔

۲۶۔ انوار احمد، اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ (فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۱۰ء)، ص ۳۷۳۔

۲۷۔ انتظار حسین، بستی (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۴ء)، ص ۱۰۲۔

۲۸۔ ایضاً، ص ۱۰۹۔

۲۹۔ ایضاً، ص ۴۷۔

۳۰۔ ایضاً، ص ۳۴۔۳۵۔

۳۱۔ ایضاً، ص ۳۸۔

۳۲۔ انتظار حسین، نیا گھر (تذکرہ) (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء)، ص ۱۳۔

باب سوم:

خالدہ حسین کے ناول کاغذی گھاٹ میں (وقت کا تقابل/ موجودہ صورت حال کی بدحالی) کے تناظر میں مطالعہ

وقت کا تقابل/موجودہ صورت حال کی بدحالی:

خالدہ حسین کا شمار اردو ادب کے نام ور ادبا میں ہوتا ہے تاہم اُن کا معروف ناول کاغذی گھاٹ اپنے موضوع کے اعتبار سے ایک منفرد نوعیت کا ناول ہے جو اپنے اندر مختلف رجحانات اور میلانات کو سموئے ہوئے ہے۔ کاغذی گھاٹ ۲۰۰۲ء میں منظرِ عام پر آیا۔ یوں تو اس میں مختلف پہلوؤں کو بروئے کار لایا جا سکتا ہے تاہم ناسٹلجیائی رجحان اس کا بنیادی رجحان ہے۔ اس ناول میں سوانحی رجحان اور ناسٹلجیا آپس میں گھل مل گئے ہیں۔ ناول میں ایک نسوانی کردار مونا ہے جو ناول کی ہیروئن ہے۔ ناول کی مصنفہ نے اپنے بچپن سے لے کر جوانی تک کے واقعات کے ساتھ اپنے عہد کے مسائل کو بھی بیان کیا ہے۔ درحقیقت یہ ناول انھوں نے یادداشت کے طور پر شروع کیا تھا جسے ناول کی حیثیت دی گئی۔ ناول کی تحریر کا مقصد بیان کرتے ہوئے وہ کہتی ہیں:

> ایک Era یعنی عہد ہوتا ہے اور دوسرا Aura یعنی مہک، میں ایک خاص عہد کی خوشبو کو مقید کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے میں نے یہ ناول لکھا۔[1]

ناول کاغذی گھاٹ کا دورانیہ تحریک پاکستان کے عروج کے زمانے سے لے کر ۱۹۶۵ء تک یعنی تقریباً تیس برس تک محیط ہے۔ یہ ناول گیارہ ابواب میں منقسم ہے۔

یہ ناول برصغیر کی تاریخ کا اہم دور ہے۔ تمام ناول ایک مرکزی کردار کے گرد گھومتا ہے جو اپنے بچپن میں تحریکِ پاکستان، مہاجرین کی آمد اور مقامی لوگوں کی ہجرت میں اپنی تمام تر حساسیت کے ساتھ شریک ہے۔

اکثر ادبا قیامِ پاکستان سے متعلق ادب میں ہجرت سے پہلے یا بعد کی باتیں سناتے ہیں اور اس واقعے کو عموماً سیاسی تناظر میں برتا جاتا ہے لیکن خالدہ حسین نے اس ناول کو ایک عام انسان یا فرد (مونا) کی حیثیت سے لکھا ہے۔ اس میں ہجرت کے نتیجے میں ہونے والے انتقال آبادی اور اس کے ثقافتی اثرات کو نمایاں کیا گیا ہے۔ چناں چہ اس کے موضوعات کا مطالعہ کیا جائے تو اس میں ایک نوزائیدہ ریاست کے سارے معاملات، تعصبات اور قومی مسائل دکھائی تو دیتے ہیں لیکن ان پر مونا کے ذاتی اثرات حاوی ہیں۔ وہ ایک گھر کے کچے آنگن، خاندانی نظام، ابتدائی گھریلو، تعلیمی

اداروں کے ماحول، ان کے نصاب، اساتذہ کے کردار، تاریخی واقعات اور اُن کے تضادات، ہندو مسلم تقاضوں کے افتراق، زمینوں، انسانوں کا رشتوں میں تقسیم ہونا مقامی لوگوں کی ہجرت، مسلم تہذیب کے نقوش چھوٹ جانے کا نوحہ، دو قومی نظریہ، سیاسی انتشار، طبقاتی تقسیم، مارکسیت، معاشرے کی بدلتی صورت حال، شادی بیاہ کے رسوم و رواج، موج میلے، مختلف بولیاں اور ثقافتی رنگ اپنی آنکھوں سے دیکھتی ہیں اور یہ واقعات خارج سے اس کے داخل میں منتقل ہو کر اس میں ایک بے چینی اور اضطراب کی سی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔ مہاجرین کی نقل مکانی، ملک کی سلامتی و استحکام، ملکی قیادت کی تبدیلی، فوج کی مداخلت اور زبان کی کشمکش سے متعلق خدشات اور سوالات اس کے ذہن کو جھنجھوڑتے ہیں جس کے جوابات نہ ملنے کی صورت میں اس کی شخصیت کہیں الجھ کر رہ جاتی ہے اور وہ داخلی خارجیت کا شکار ہو جاتی ہیں۔

خالدہ حسین کی تحریروں میں ماضی زندہ و جاوید نظر آتا ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ ماضی کو بہ طور یادداشت ناول کی صورت میں مقید کر لیتی ہیں۔ انھیں ماضی کی ہر شے سے رغبت تھی جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے باطنی تبدیلی کو قبول نہیں کیا اور ان کا ذہن آج بھی ماضی اور حال سے وابستہ و پیوستہ نظر آتا ہے۔ چناں چہ ناول میں منظر کشی کرتے ہوئے مصنفہ قدیم ادوار کی رونقوں اور رعنائیوں کو اس طرح سمیٹتی ہیں کہ ماضی کا ایک پورا عہد بھرپور انداز میں زندہ ہو جاتا ہے۔ اس ناول پر بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر ممتاز احمد کا کہنا ہے کہ:

> ناول کا عنوان کاغذی گھاٹ علامتی حقیقت رکھتا ہے جہاں امیدوں کی کشتیاں کنارے لگتی ہیں مگر مایوسی و ناامیدی کی موجیں اُن کو بہا کر لے جاتی ہیں اور کاغذی گھاٹ انہی بنیادوں پر کھڑا رکھنے کی تگ و دو کرتا رہتا ہے۔[۲]

ناول کے کرداروں اور واقعات کے تناظر میں موجودہ وقت کا تقابل ماضی کے ادوار سے کیا جائے تو ناول کی تمام تر جزئیات کو ناسٹلجیائی پیرائے میں یوں بیان کیا جاتا ہے۔

کاغذی گھاٹ کے عنوان کے متعلق خالدہ حسین کا کہنا ہے:

> میں نے اس سے مراد کتابی دنیا لی ہے یعنی لکھنے کی دنیا اور یہ عنوان خواجہ حسن نظامی کے مضمون سے ماخوذ ہے۔[۳]

اس طرح کاغذی گھاٹ کی معنویت کو ظاہر کرتے ہوئے خواجہ حسن نظامی کہتے ہیں:

> دھوبی نے کہا یہ میلی گدڑی ساری دنیا ہے۔ خود ہمارے وجود ہیں اور ان گناہوں اور شک و شبہ کے دھبوں کو دُور کرنے کے لیے خدا نے یثرب نگر، جو عرب میں ہے اور جس کو مدینہ کہتے ہیں ایک بڑے

چوہدری کو پیدا کیا جس نے سارے جہان کے دھبے دُور کر دیے اور یہ سب میلی گدڑیاں دھو کر رکھ دیں۔ یہی تو وجہ ہے کہ میں بے چارہ غریب دھوبی کاغذی گھاٹ پر کپڑے دھونے آیا ہوں۔[۴۲]

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ ناسٹلجیا ہجرت کی پیداوار ہے۔ یہ بات بالکل درست ہے کہ ہجرت کے باعث ناسٹلجیا نے جنم لیا لیکن اس کے علاوہ بھی بہت سے عوامل ہیں جو فرد کو ناسٹلجیک بناتے ہیں مثلاً کسی خواہش کا پورا نہ ہونا، توقعات کے خلاف واقعات کا وقوع پذیر ہونا، حساسیت، غمزدہ ہونا، بیرونِ ملک کسی بھی کام، ملازمت یا حصول علم کے لیے جانا، دوستوں اور اپنے قریبی رشتہ داروں سے بچھڑ جانا ایک جگہ سے دوسری جگہ ہمیشہ کے لیے چلے جانا، تسلسل کی آرزو، احساس زیاں، خود کو دہرانے کی خواہش، خوابوں میں جینے کی خواہش، گزرا پل، جڑوں سے کٹ جانا، ماضی کی یاد دلانے والی اشیا وغیرہ۔ یہ تمام وجوہات ناسٹلجیا کا باعث بنتی ہیں اس مقصد کے لیے خالدہ حسین کے ناول کاغذی گھاٹ میں ناسٹلجیا کی ان وجوہات کو تلاش کرنا اور ان کا تقابل موجودہ (حال) کا ماضی سے کرنا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ اردو ادب میں قیام پاکستان سے پہلے ناسٹلجیا کو کئی حوالوں اور کئی طریقوں سے پیش کیا گیا جس کو ناقدین نے مختلف طریقوں سے بیان کیا اور اس کے پس منظر میں کارفرما عوامل کا سراغ لگایا۔ ناول کاغذی گھاٹ کے بے شمار زاویے متعارف ہوئے جن میں کاغذی گھاٹ کی معنویت پر مباحث ہوئے ہیں تاہم اس باب میں موجودہ وقت کا تقابل ماضی سے کرتے ہوئے ناول میں مصنفہ کے انفرادی شعور کو واضح کیا جائے گا۔

انسانی فطرت ہے کہ وہ ہر جگہ اور ہر صورت حال میں دوہرے رویوں سے دوچار رہتا ہے۔ یہ رویے اس کی سوچ اور فکر میں تقابلی صورت حال کو جنم دیتے ہیں۔ اس لیے وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اپنی موجودہ حیثیت اور قدروں کو کسی اور دور کے معیارات کے ساتھ تقابل کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ناول کی واحد متکلم بھی جدید دور میں سانس لیتے ہوئے ماضی کے اوراق میں پناہ گزیں نظر آتی ہیں اور ہر لمحہ اپنے آج کا تقابل گزرے کل کے ساتھ کرتی ہیں۔ اس کردار کے لیے گزرا ہوا دور اور اس میں بسنے والے لوگ ایک خوش گوار تاثر بن کر سامنے آتے ہیں۔

گزشتہ دور کے واقعات اس کردار کے ذہن پر اس تازگی سے ثبت ہیں کہ کہیں بھی کسی واقعے کا کوئی حصہ اُس کے ذہن سے محو نہیں ہوتا اور نہ ہی کسی کردار کا کوئی تاثر مسخ ہوتا محسوس ہوتا ہے۔ ماضی میں گھر کے بڑے بوڑھے پورے خاندان اور افرادِ خانہ کے لیے قابلِ تعظیم کردار ہوتے تھے جن کی ہر بات اور ہر عمل میں ایک وزن ہوتا تھا۔ اُن کی غیر موجودگی میں بھی افرادِ خانہ اُن کی باتوں کو اہمیت دیتے ہیں۔ ناول میں واحد متکلم کے نانا کا کردار بھی ایسا ہی کردار ہے جس کی شخصیت کا تاثر اُس کے دنیا سے رخصت ہونے کے بعد بھی قائم ہے:

> یہاں پر ایک غیر حاضر شخصیت کا سحر طاری تھا جو تمام در و دیوار میں سرایت کر چکا تھا۔ وہ بہت سوچتی تو کانوں تک پٹوں اور سفید داڑھی والی ایک نورانی صورت ذہن میں آجاتی۔ نانا جو شہر کے بہت بڑے

رئیس تھے جن کی ڈیوڑھی پر بے شمار غریب، مسکین اور بیواؤں کی پرورش ہوتی تھی جو شہر کے سب سے بڑے رئیس تھے۔ دو گھوڑوں کے فلٹن رکھتے تھے اور زیادہ تر فارسی میں گفتگو کرتے تھے۔ مگر پھر کسی دشمن کے ساز باز نے ان کو لکھ سے کھ کر دیا اور جن پر قاتلانہ حملے ہوئے اور جنھیں زہر دینے کی کوشش کی گئی اور جو کسمپرسی کی حالت میں اس دنیا سے رخصت ہوئے مگر اب بھی ان در و دیوار میں بستے تھے۔[۵]

ناول میں واحد متکلم کو اپنے نانا کی یادیں اور گزرے پل کو یاد کر کے اُداس ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ وہ جب بھی کشمیری چائے میں کلچہ بھگو کر کھاتی اسے اپنے ارد گرد ان دکھتی چیزیں اور لوگ پھیلے محسوس ہوتے۔ اس بستی میں بہت عجیب و غریب لوگ بستے تھے جو دور ہوتے ہوئے بھی ان گھروں میں ڈیرے ڈالے تھے۔

نانا کا کردار جو کہ ایک پڑھا لکھا کردار ہے اور کمال مہارت رکھنے والی شخصیت کا رعب و جلال پورے خاندان پر حاوی رہنا ایک فطری بات ہے تاہم موت کے بعد بھی اس شخصیت کا رعب اور تاثر قائم رہنا یہ خلاف اصول بات محسوس ہوتی ہے کیونکہ آج کے دور میں بڑے بوڑھوں کو ان کی زندگی میں ہی گھریلو معاملات اور فیصلوں سے بے دخل سمجھا جاتا ہے۔ چہ جائیکہ ان کے دنیا سے جانے کے بعد بھی ان کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے۔ یہ موجودہ حال کا ماضی کے ساتھ تقابل ہے جو واحد متکلم کو افسردہ کر دیتا ہے۔

واحد متکلم کا تخیلاتی زاویہ ناول میں اس قدر مضبوط تاثر کے ساتھ ابھرتا ہے کہ اس کردار کی یادداشت کی داد دینا پڑتی ہے۔ گزرے دور کی آوازیں اور ہر لمحے کے جذبات و احساسات بھی اس کردار کے حافظے سے محو نہیں ہوتے۔ یہاں تک کہ ناول میں اس فقیر کی آواز اور اس کو کوسنے کے بعد محسوساتی زاویے بھی مصنف کی زبانی ہم تک پہنچتے ہیں:

کوئل کی یہ آواز لگانے والا بھی نظر نہ آتا تھا۔ یہ معلوم کہاں سے کہاں اس کی آواز سفر کرتی تھی۔ اس کا کتنا جی چاہتا اس کو دیکھنے کو آندھی، بارش، طوفان میں بس اپنے مقررہ وقت پر اس کا صدا لگانا مقرر تھا۔ شاید وہ کسی سے کچھ لیتا بھی نہ تھا۔ بس وہ ایک دکھ بھری لے تھی۔ اس کے پاؤں کے چھالے، ان کی جلن، درد کی لہریں سب کی آواز تھی۔ یہ سب کیا ہے۔ ہر شے خواب سی لگتی ہے۔[۶]

اقتباس کا آخری جملہ معنی خیز ہے۔ اس میں مصنفہ کی ماضی کی طرف لوٹنے کی خواہش کا اظہار ہوتا ہے۔ دراصل ماضی کے ہر کردار اور واقعے میں اتنی سچائی اور گہرائی موجود ہے کہ یہ تمام تاثرات آج کے دور میں ناپید نظر آتے ہیں۔ چنانچہ ان تمام واقعات کو بیان کرتے ہوئے مصنفہ کے تحت الشعور میں دراصل ایک تقابلی رو چل رہی ہوتی ہے جو موجودہ دور کی بے رُخی اور مصنوعی پن کا ماضی کے سادہ اور شفاف احساسات کے ساتھ تقابل کرتی ہے جس سے واحد متکلم کے اندر ماضی کے دور میں ایک بار پھر جی اُٹھنے کی خواہش جنم لیتی ہے۔

چنانچہ ناول میں مصنفہ کا تخیلاتی زاویہ ماضی کی ہر یاد کو قاری تک بخوبی پہنچاتا ہے۔ واحد متکلم ناول میں بیان ہونے والے کرداروں کو کچھ یوں ظاہر کرتی ہے کہ ماضی کا تمام عکس واضح ہو جاتا ہے:

> بڑی اماں کچھ پڑھ پڑھ کر گھر کے کونوں میں دم کرتیں۔ بجلی کڑکتی۔ خوف کی زردی ان کے چہرے پر کھنڈ جاتی۔ بجلی اور کڑک کا خوف، ایک شدید کیفیت جو انسانوں سے ہوتی پورے شہر میں پھیل جاتی۔ بڑی اماں پولے پولے قدموں سے تمام گھر میں گھومتیں۔ الماریوں اور سنگھار میز کے شیشوں کے کپڑے سے ڈھانکتی چلی جاتیں۔ بجلی کی چمک، اس کی تڑپتی لہر آئینوں میں منعکس ہوتی تھی۔ ان لوگوں کا تخیل کتنا حساس تھا۔[۷]

اقتباس کا آخری جملہ وقت کے تقابل کی نشان دہی کرتا ہے کہ ماضی میں لوگوں کا تخیل کس قدر حساس تھا۔

ہر دور ایک نئی تبدیلی کے ساتھ داخل ہوتا ہے۔ جیسے جیسے زمانہ بدلتا ہے اس کے تقاضے اور ضروریات بھی بدلتی رہتی ہیں مگر اس کے باوجود انسان کا رشتہ ماضی سے بدرجہ اتم موجود رہتا ہے کیونکہ یہ انسانی فطرت ہے کہ وہ ماضی کو کبھی بھلا نہیں سکتا۔ ماضی کی تمام تر جھلکیاں انسان کے وجود کو محصور کرتی رہتی ہیں اور یہی آدمی کی فطرت ہے کہ وہ ماضی کو اپنے ساتھ جوڑ کے رکھنا پسند کرتا ہے۔ پرانے خیالات، واقعات، تجربات، اشخاص اور جگہوں سے وابستگی اس کے شعور کو پختگی عطا کرتی ہے۔ چنانچہ اُن تمام تر تجربات کو بیان کرنا ایک فطری عمل ہے۔ اسی طرح مصنفہ بھی ماضی کے قصہ کو کچھ یوں بیان کرتی ہیں:

> کہتے ہیں اس زمانہ میں شہر کے بیچوں بیچ ہر سال منڈی لگتی تھی۔ جہاں آس پاس اس کے قصبوں اور دیہاتوں سے بے شمار لوگ اپنے پالتو جانور فروخت کی خاطر لاتے تھے۔ وہاں پر جانوروں کی خرید و فروخت بھی ہوتی تھی اور ایک میلہ بھی لگتا جس میں طرح طرح کی تفریح کا سامان بھی ہوتا تھا۔ گھ گو گھوڑے رنگین پتلیوں سے بنی چھابیاں اور جھنجھنوں کے ساتھ گڑ اور تلوں کی مٹھائیاں اور مٹی کے کورے گھڑوں اور ہانڈیوں کے علاوہ چرخ یوں کرتے ہنڈولے اور گنے کی روہ نکالتے بیلنے سبھی کچھ ایک رنگین بساط ایسا بچھا ہوتا۔ پنجابی کھسے جن پر شوخ ہرے سرخ اور فیروزی اور بسنتی پھمن لگے ہوئے اصل چمڑے کی بو پھیلاتے۔ کھسے جن کا اُلٹا سیدھا پاؤں نہ ہوتا بلکہ خود پہننے والا ایک کو اُلٹا ایک کو سیدھا بنا لیتا۔ شوخ لاچے اور گھیر دار گھگرے اور لمبے کرتوں اور کانوں میں جھولتی چاندی کی بالیوں اور رنگین موتی تلے دار پراندوں میں لدی مٹیاریں سرگودھا، خوشاب، جھنگ اور راوی کنارے کی بولی میں ہانک لگاتی چوڑے کھنکھناتی پرتیں۔ یہیں پر دیہات کے بانکے گلے اکھاڑے کا مظاہرے بھی کرتے تھے جس کو آج کل ٹینٹ پیگنگ بھی کہا جاتا ہے۔[۸]

اقتباس میں ماضی کی اُن رنگینیوں اور رونقوں کو بیان کیا گیا ہے جو آج کے دور میں شاذ و نادر ہی نظر آتی ہیں

بلکہ کہیں کہیں تو ناپید ہیں۔ اگر ماضی کا حال سے تقابل کیا جائے تو دورِ جدید نے مشین اور ٹیکنالوجی کو اپنا محور بنالیا ہے۔ مشین کا پہیہ جس قدر تیزی سے گھومتا ہے اسی طرح انسانی زندگی اور جدید دور کی رفتار بھی تیز تر ہو گئی ہے۔ دنیا سمٹ کر رہ گئی ہے مگر ماضی کی رونقیں جو ناسٹلجیائی کیفیت کی صورت میں واحد متکلم کے دل میں کلیاں کھلاتی ہیں۔ وہ اسے کبھی فراموش نہیں کر سکتی اور اسے بار بار دہرا کر مسرت محسوس کرتی ہیں۔

تاہم مصنفہ ناول میں ان تمام جزئیات کو ناسٹلجیائی پیرائے میں بیان کرتی ہیں جو ابتدائی دور کے پاکستان کی تہذیب و ثقافت کا حصہ تھیں۔ اس دور کی ثقافت جس میں زیادہ تر متوسط طبقے کا رہن سہن ملتا ہے۔ وہ ان رسوم و روایات کا ذکر بھی کرتی ہیں جو آج کے دور میں یکسر تبدیل ہو گئی ہیں۔ مصنفہ عورتوں کے مقام و مرتبہ، ان کی تعلیم و تربیت، شادی بیاہ کے رواجوں اور جہیز کے مسائل کو بھی موضوع بناتی ہیں اور اس طرح بظاہر روشن خیال دکھنے والے معاشرے کی منافقت کو بھی بے نقاب کر دیتی ہیں۔ چوں کہ ان کی مادری زبان پنجابی ہے اور وہ پنجاب کی سرزمین کی پروردہ ہیں۔ اس لیے پنجاب کی ثقافت ان کے ہاں نمایاں ہے۔ وہ کھانے پینے کی چیزوں سے لے کر، مویشی منڈیوں، قصبوں اور میلوں ٹھیلوں میں بھی اسی ثقافت کو کھوجتی نظر آتی ہیں اور قاری کو اپنے تجربات میں پوری طرح شریک کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔

عمومی سطح پر دیکھا جائے تو ناسٹلجیا ماضی کے اشخاص، جگہوں اور واقعات سے وابستگی کا اظہار ہے۔ یہ وابستگی ایک ایسی جذباتی کیفیت سے عبارت ہے جس سے دوچار شخص موجودہ حال سے بیزاری، الجھاؤ اور تھکن کا شکار نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُسے گزرا ہوا دور زیادہ دلچسپ، خوش گوار اور مسحور کن نظر آتا ہے۔ موجودہ حال اور گزرے ہوئے کل کا یہ تقابل ہی ناسٹلجیا کو جنم دیتا ہے۔ یہ ایک ایسی مثبت توانائی کا نام ہے جو گزرے ہوئے دور کے اشخاص اور جگہوں سے وابستہ ہوتی ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہمیں کچھ جگہیں پسند نہیں آتیں لیکن وہاں پر گزرا ہوا وقت یاد آتا ہے۔ یقیناً یہ اُس گزرے ہوئے وقت سے وابستہ توانائی اور تعلق ہوتا ہے جو ہمیں بار بار اُس دور کی یاد دلاتا ہے، مثلاً:

> لائل پور کی ان گلیوں میں کچھ تھا یہ تو وہ خود بھی مانتی تھی۔ چھوٹی چھوٹی سرخ اینٹوں سے بنی گلیاں، اونچے اونچے دو منزلہ مکان کہ عرفِ عام میں چوبارے کہلاتے تھے۔ لکڑی کے چھجے، بالائی منزل کے روشن کمرے، روزانہ دھلنے والے شفاف فرش جن کی سرخ اینٹیں ٹھنڈی ٹھنڈی چمکا کرتیں۔ ان کمروں میں عجب طرح کی کشادگی تھی۔ کھڑکیوں پر باریک رنگین تیلیوں کی چقیں گری رہتیں جن سے چھن چھن کر دھوپ اور روشنی اندر آتیں۔ فرش پر طرح طرح کے نمونے بناتیں۔ گرمی کی لمبی چھٹیوں میں وہ سب کے سب ان گھروں میں براجمان ہوتے۔ گویا پرندے چھٹ کر اونچی اڑان کے بعد دانے دُنکے پر آن بیٹھے ہوں۔ ہاں ان دنوں محض دانے دنکے ہی سے کام تھا۔ کچھ کچھ وقفوں پر گلی

میں پھیری والے صدا لگاتے۔ یہ صدائیں لاہور کی گلیوں کی طرح ان میں شدید حسرت پیدا نہ کرتیں یہاں پر کھڑکی میں سے ذرا سا جھانک کر صدا لگا کر پھیری والے کو روکا بھی جا سکتا تھا۔ کتنی آزادی تھی یہاں۔[9]

ناول کے اس اقتباس میں ان واقعات اور جگہوں کا ذکر ہے جو مصنفہ کی یادداشت کا حصہ بنتے ہیں اور مصنفہ کو ایک ناسٹلجیائی کرب میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ گزرے پل کا تقابل اُسے حال کی نسبت زیادہ دل چسپ معلوم ہوتا ہے اور یہی ناسٹلجیائی کیفیت ہے۔

ناول کا مرکزی کردار مونا ہے۔ مونا جبر و قدر، تاریخ کے بدلتے تناظر، وقت کی ستم ظریفی اور انسانی مقدرات پر غور و فکر کرتی ہے۔ ناول میں جگہ جگہ اس کا ذکر ملتا ہے۔ مثلاً ناول کے ابتدائی صفحات میں جب اس کی ملاقات ایک لڑکی سے ہوتی ہے تو وہ اُسے اپنی کتابیں پڑھنے کے لیے دیتی ہے، تو اس کا ذہن بیتے دنوں کو یاد کرتا ہے۔

مونا کے باپ کا کردار ایک ایسا کردار ہے جو پرانی روایات اور مذہب کے کھونٹے سے بندھا ہوا ہے۔ تقسیمِ ہند کے بعد جب اقدار میں تبدیلیاں ہوتی ہیں تو پھر بھی اپنی اقدار سے جڑے رہتے ہیں مگر اولاد کی تعلیم و تربیت سے کسی لمحے غافل نہیں ہوتے۔ مونا کی والدہ بھی مذہبی شخصیت ہیں اور گھر کے افراد کو ایک ڈوری میں باندھے ہوئے ہیں۔ پڑوسیوں کے دکھ درد میں بھی شریک ہوتی ہیں۔ بڑی اماں اور بڑے ابا کے کردار ماضی کی پرچھائیوں کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں۔ ان کرداروں کے ہر عمل سے ناسٹلجیائی کیفیت ظاہر ہوتی ہے۔ بڑی اماں کے اچانک مر جانے پر جب ابا کو لاہور آنا پڑا تو وہ اپنے بیتے وقت کو بہت یاد کرتے ہیں:

ان گلیوں میں کچھ تھا۔ یہ تو وہ مانتی تھی مگر بڑی اماں کے اچانک مر جانے کے بعد ابا کو وہ گلیاں چھوڑ کر لاہور آنا پڑا۔ اور لاہور آ کر انھیں چپ لگ گئی۔ یوں جیسے پودے کو دھوپ اور نمی نہ ملے تو وہ پودا مرجھاتا چلا جاتا ہے۔ بڑے ابا بھی مرجھاتے چلے گئے۔ انھیں کوئی بھی یاد نہ آتا تھا۔ بڑی اماں بھی نہیں۔ مگر وہ گلیاں وہ چوبارے وہاں کی مٹی کبھی اکیلے میں وہ اماں سے بڑی رازداری کے ساتھ بس اتنا ہی پوچھتے۔[10]

وو ہٹی! میں کبھی لائل پور جاؤں گا؟
اور اماں انھیں حسب عادت تسلی دیتیں کیوں نہیں۔
تاں جی ہم سب جائیں گے مگر.....وہ بیچ میں خاموش ہو جاتیں۔ زمیں سے محبت کتنا دکھ دیتی ہے اگر کہیں اس سے بچھڑ جاؤ تو بالکل جیسے کوئی اماں سے بچھڑ جائے۔[11]

مصنفہ جب بھی گزرے وقت کو یاد کرتی ہیں تو انھیں بیتا ہوا کل آج کی نسبت زیادہ خالص، سادہ اور دلکش نظر آتا ہے اور انھیں حقیقی راحت اُسی دور کو یاد کرنے سے ملتی ہے جو گزر چکا ہے۔ وہ لائل پور کو یاد کرتی ہیں جہاں ان کا آبائی گاؤں تھا۔ ان گلیوں کی رونقوں کو یاد کرتی ہیں جہاں پھیری والے صدا لگاتے تھے اور آزادی سے بلا جھجک جھانک کر صدا لگانے والے کو روک لیا جاتا تھا۔ یہ وہ یادیں تھیں جو مصنفہ کو ناسٹلجیا کا شکار کر دیتی ہیں۔ گویا چیزوں سے گہری وابستگی جو یادِ ماضی کا حصہ ہیں ان کو یاد کرنا ایک فطری عمل ہے۔

ناول میں بیان ہونے والے واقعات مسلسل ایک ناسٹلجیائی کیفیت کو ظاہر کرتے چلے جاتے ہیں۔ خصوصاً ناول کے کرداروں میں ماضی کی طرف لوٹنے کی شدید خواہش پائی جاتی ہے۔ مونا جب اپنے ماضی کو یاد کرتی ہے تو اُسے لائل پور میں گزارا وقت اس طرح یاد آتا ہے کہ وہاں کی ہر ایک چیز کو وہ یاد کرتی ہے۔ وہ چیزیں جو اس کے احباب سے وابستہ تھیں اس کی نانی نانا کا گھر، وہاں کا طرز بود و باش، رنگین پایوں کے پلنگ، تخت، آرام دہ کرسیاں، کوٹھری میں رکھے پینٹ کیے ہوئے لوہے کے صندوق، چھوٹے بڑے دیگچوں کا ایک مینار سا کھڑا ہونا۔ یہ ایک سادہ طرز کا رہن سہن تھا جو نہایت آرام دہ اور خالص پن سے مزین تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ماضی کے سادہ اور شفاف احساسات واحد متکلم کو ماضی کی طرف پلٹنے اور اس میں جی اُٹھنے کی خواہش پر آمادہ کرتے ہیں:

> کمرے چھوٹے ہونے پر بھی کشادہ نظر آتے تھے۔ شاید اس لیے کہ وہاں صرف ضرورت کا سامان رکھا جاتا تھا۔ رنگین پایوں کے وہ ایک پلنگ، کوئی تخت، ایک دو آرام کرسیاں، کوٹھری میں لوہے کے پینٹ کیے ہوئے صندوق تلے اوپر ترتیب سے رکھے جن پر سفید براق غلاف پڑے ہوتے تھے اور ایک کونے میں چھوٹے بڑے دیگچوں کا مینار کھڑا ہوتا۔ ان میں کہیں بڑی رازداری کے ساتھ چڑوھا اور ریوڑیاں چھپی ہوتیں۔ کسی ایک میں خاص آرڈر پر بنے بسکٹ۔ پھر دیوار پر کھونٹیوں کی لمبی قطار جس پر بڑے ابا کا کچہری کا کوٹ، دھوبی کی دھلی لٹھے کی کلف لگی شلوار چھڑی، بڑی اماں کی شٹل کاک کا برقعہ لٹکتے باہر برآمدے کے اندر ہی ایک کونے میں باورچی خانہ، جس کے چولھے ہر دم صاف شفاف چمکا کرتے۔ سامنے کونے میں پانی حمام، جس کے قریب برتن دھلا کرتے تھے۔[۱۲]

خالدہ حسین کو ماضی کی ہر شے سے رغبت تھی۔ ماضی کے ادوار، علاقوں اور اشیاء سے خاص انسیت تھی۔ وہ ناول کے اقتباس میں جس طرح ایک خاص عہد کی تصویر کشی کرتی ہیں۔ قدیم ادوار کی رونقوں کو اس طرح سمیٹتی ہیں کہ ماضی پورے جوبن سے کھل کر سامنے آجاتا ہے۔ ماضی کی منظر کشی کرتے ہوئے اور واقعات کو بیان کرتے ہوئے ماضی کے واقعات کی طرف مراجعت کر جاتی ہیں۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے باطنی طور پر وقت کی تبدیلی کو قبول نہیں کیا اور ان کا ذہن آج بھی ماضی اور حال کے دوراہے پر کھڑا نظر آتا ہے۔

ناول میں جس طرح واقعات بیان کیے گئے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنفہ کو ماضی کی رقابتیں بہت شدت سے یاد آتی ہیں وہ گزرے لمحوں کی ہر یاد کو لفظوں میں اس طرح سمیٹ لیتی ہیں گویا سارا منظر آنکھوں کے سامنے ہو۔ چناں چہ مونا جو ناول کا مرکزی کردار ہے ان تمام احباب کو بھی یاد کرتی ہے تو اس کا دل غمگیں ہو جاتا ہے۔ مثلاً مونا کے ابا کے دوست ہری لال نندہ وپری صاحب اور مسٹر مہتا تھے۔ وہ سوچتی ہے کہ اب وہ لوگ پتہ نہیں کہاں ہوں گے۔ اسی طرح ان کا پرانا چپڑاسی جو گادھر بھی اُسے یاد آتا ہے:

> ہری لال نندہ کی پوری بس سروس تھی ان کی بیوی بے حد گول مٹول چہرے والی تھی جس کے ماتھے پر ہر دم سرخ شوخ رنگ کی بندیا چمکتی اور موٹے ہونٹ بھی گہری لال لپ سٹک میں رنگے رہتے۔ وہ ایک سڑک پار شملہ پہاڑی کے قریب رہتے تھے۔ قریب ہی دانتوں کے ڈاکٹر بخشی سنگھ کا گھر تھا جن کی بیوی بلند قامت، ہنسوڑ اور اونچی آواز میں بات کرتی تھی۔
>
> مگر اب وہ سب غائب ہو چکے تھے اچانک اُسے ان شہروں سے نفرت ہو گئی جنھوں نے ان پیارے لوگوں کو نگل لیا تھا۔ [۱۳]

مونا کے مد مقابل نسوانی کرداروں میں عائشہ اور افروز ہیں۔ افروز ایک مزدور رہنما جال کی عاشق ہے اور سوشلسٹ نظامِ حیات کی مداح ہے۔ گھر میں اس کے بھائی کے علاوہ تمام لوگ اس کے خیالات کے مخالف ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مخالفتوں کے درمیان اپنی ضد کے تحت، وہ اپنی مرضی سے زندگی گزارنے کا زبردستی حق لے کر اپنے گھر والوں کے لیے ناپسندیدہ شخصیت بن جاتی ہے۔ ابتدا میں وہ مونا کو بتاتی ہے کہ کسانوں اور مزدوروں پر ظلم ہو رہا ہے:

> اسکول میں افروز اسے بتاتی ہے کہ اب انقلاب آنے والا ہے کیونکہ کسان پر بہت ظلم ہو رہا ہے اور زمیندار اور جاگیر دار انتہائی سفاک لوگ غریبوں کو بھوکا مار رہے ہیں اور درانتی کا نشان اب انسانیت کا پرچم بن رہا ہے۔ [۱۴]

مگر وہ خوش نہیں ہے، اس لیے کہ زمانہ بدل نہیں رہا۔ استحکام، ظلم و ستم اور بھوک وہیں کی وہیں ہے۔ مونا کی دوسری سہیلی عائشہ ہے جس کا بر گر فیملی سے تعلق ہے۔ اس کی شادی دھوم دھام سے کر دی جاتی ہے، لیکن اس کا شوہر ظالم نکلتا ہے۔ وہ خود تو خوش حال زندگی بسر کرنا چاہتی تھی، مگر شوہر نام اور بڑے عہدے کا شائق تھا۔ یوں عائشہ کے خواب چکنا چور ہو جاتے ہیں۔ اس کی خواہشات کا گلا گھونٹ دیا جاتا ہے جو نا سٹلجیا کو جنم دیتا ہے۔

مونا کا کردار مستقل طور پر نا سٹلجیا کا شکار نظر آتا ہے، وہ ہر بات کو اس کی تہ تک سوچتی ہے۔ وہ یہ سوچتی ہے کہ عائشہ اور افروز کتنی خوش قسمت ہیں کہ وہ حصوں میں نہیں بٹی ہوئیں۔ وہ دوسروں پر تنقید نہیں کرتی، ان کے ہاں کوئی تضاد نظر نہیں آتا لیکن اس کا اپنا وجود بہت الجھا دینے والا ہے:

اب پہلی بار اس کو شدت سے احساس ہوا کہ وہ کیا کچھ کھو بیٹھی ہے کیا کچھ گنوایا اور اپنے سرمائے کے چھن جانے کا احساس، اس سے جدائی کی چبھن نے اس کو ایک مسلسل اداسی اور احساسِ محرومی میں مبتلا کر دیا۔ کبھی وہ سوچتی کاش یہ سب کچھ ہم سے نہ چھینتا مگر یہ سب بہت غیر واضح بہت الجھا دینے والا تھا۔ ایک گھمبیر مایوسی اسے لپیٹ میں لے لیتی۔[۱۵]

جو کچھ ہو چکا ہے گزر گیا ہے اس کے گزرنے کا افسوس اور جو کچھ نیا ہونے والا ہے اس میں خود کو عادی بنانا ایک مشکل عمل ہے۔ مصنفہ کے ہاں بھی یہی کیفیت نظر آتی ہے جس کی وجہ سے وہ ناسٹلجیا کا شکار ہیں۔

ناسٹلجیا کی کئی صورتیں ہیں، جن میں ایک صورت تسلسل کی آرزو ہے۔ ناول کی مصنفہ کے ہاں بھی یہ تسلسل نہ ٹوٹنے کی خواہش پائی جاتی ہے۔ وہ زندگی کی رونقوں کو دائمی دیکھنا چاہتی ہیں۔ عائشہ اور افروز ناول کے وہ کردار ہیں جو دو مختلف تہذیبوں کے نمائندہ ہیں۔ مصنفہ نے ان کرداروں کا موازنہ ناول میں کچھ اس طرح کیا ہے:

عائشہ اور افروز ایک دوسرے کا تضاد تھیں۔ ایک کسی بھی تہذیب، کسی بھی کلچر کی دعوے دار نہ تھی، جب کہ دوسری کے پاس صدیوں کا تہذیبی ورثہ تھا جس سے بچھڑ کر وہ گویا بہت غیر ترقی یافتہ نیم مہذب لوگوں میں آ گئی تھی۔ یہاں کے لوگ آدابِ محفل سے قطعی ناآشنا، زبان و بیان کی لطافت اور شائستگی سے عاری، کھردرے اور اجڈ تھے۔ ان کے پاس سادگی، بلند آہنگی اور سیدھی سچی بات کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ عائشہ کی تراش خراش اس طرح کی جا رہی تھی جس طرح کہ ایک خاص عمر میں لڑکوں کو سوسائٹی میں متعارف کرایا جاتا ہے جب کہ وہ خود مونا خوف اور تحفظ کی دھوپ چھاؤں میں کھوئی ہوئی تھی۔[۱۶]

ناول کی مصنفہ نے دو ایسے کرداروں کو ناول میں بے نقاب کیا ہے جو دو مختلف سوسائٹیوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک کا تعلق برگر فیملی سے ہے جہاں شہرت اور عہدے کی خواہش ہے۔ خواب و خیال کی دنیا ہے اور انہی خوابوں میں زندہ رہنے کی تمنا بھی۔ ایک خاص تہذیب سے وابستہ لوگ، آدابِ محفل اور اپر سوسائٹی کے باسی ہیں جبکہ دوسری طرف سادگی، بلند آہنگی اور سیدھی سچی بات کہنے کے رواج ہیں۔ لوگ کھرے اور کم تہذیب یافتہ ہیں۔ عائشے جب اس کلچر کا حصہ بنتی ہے تو اس کا ذہن اس ماحول کو قبول نہیں کر پاتا۔ وہ مایوسی اور بے چینی کا شکار ہو جاتی ہے۔ اُسے اپنا ماضی حال کی نسبت زیادہ خوش گوار لگتا ہے۔ ماضی کے گزرے لمحات کو وہ مسلسل دیکھنا چاہتی ہے۔ نئے ماحول اور نئی اقدار کے ساتھ نئی تہذیب میں اُسے خود کو عادی بنا دشوار سا لگتا ہے۔ یہ تمام صورت حال ناسٹلجیائی عناصر پیدا کرنے کا سبب بنتی ہے۔

مصنفہ نے دو مختلف کرداروں کے ذریعے دو تہذیبوں کے تصادم کو بھی واضح کیا ہے۔ ایک وہ جو دولت،

شہرت، مادیت پرستی اور خود غرضی جیسے رویوں سے مزین ہے اور ایک ایسی معاشرت کو بے نقاب کیا گیا ہے جس میں مصنوعی پن ہے، منافقت ہے جب کہ اس کے برعکس خالصیت اور سادہ پن ہے۔

مصنفہ نے ناول میں عائشہ کے کردار کو یوں پیش کیا ہے کہ وہ بھی ناسٹلجیا کے کرب میں مبتلا نظر آتی ہے۔ وہ ایک مہذب خاندان کی نمائندہ ہے جو ہجرت کر کے پاکستان تو آ گئی ہے لیکن ماحول سے مطمئن نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی باتوں میں ہمیشہ دہلی، تاج محل، الہ آباد، لال قلعہ اور قطب صاحب وغیرہ کے حوالے ہوتے ہیں۔ وہ اونچی اڑان اڑنے والوں میں سے ہے۔ اس لیے زمانے کی چال چلتے ہوئے ایک نو دولتیے افسر سے شادی کر کے اپنا طبقہ بدلنے میں تو وہ کامیاب ہو جاتی ہے لیکن بہ حیثیت بیوی عزت حاصل نہیں کر پاتی۔

عائشہ کے کردار میں خواہشات کے پورا نہ ہونے کی کسک پائی جاتی ہے۔ واقعات و حالات اس کی توقعات کے خلاف چلے جاتے ہیں۔ جو خواب وہ اپنی آنکھوں میں سجائے ہوئے تھی ان کے بکھر جانے کا غم اُسے مسلسل بے چین اور اضطراب کی کیفیت میں مبتلا کر رہا ہے جس کے باعث اس کا دکھ ناسٹلجیا کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

مونا کا کردار مستقل طور پر ناسٹلجیا کا شکار ہے۔ ایک اور انداز میں اس کے ہاں ناسٹلجیا دکھائی دیتا ہے، وہ پنجابی زبان کا ہے۔ پنجابی زبان سے وہ خاصی رغبت رکھتی ہے کیونکہ ان کی اپنی زبان پنجابی ہے۔ اردو کے قومی زبان بننے پر خوشی کا اظہار کرنے کے باوجود وہ لسانی اور ثقافتی شناخت کے گم ہونے پر نوحہ خواں ہے۔ جب پنجابی زبان کو کھردرا اقرار دے کر بیشتر خاندانوں میں اردو بولنے کا رواج چل نکلتا ہے تو وہ سوچ میں پڑ جاتی ہے، کیوں کہ گھروں میں بچوں کے پنجابی بولنے پر پابندی لگا دی گئی اور وہ اردو اور انگریزی کے چکر میں پڑ کر اپنی مادری زبان بولنے سے قاصر ہو گئے ہیں۔ یہ نوحہ اور دکھ درد صرف انھیں پنجابی زبان کے لیے ہی نہیں ہے بلکہ اُن تمام مقامات کے لیے ہے جنھیں مصنفہ اپنا ورثہ سمجھتی ہے۔ ان میں لال قلعہ، قطب صاحب، تاج محل سمیت مغل ثقافت کے تمام مظاہر شامل ہیں جن کو کھو دینے کا دکھ مصنفہ کو ہر قدم پر ہے۔ اس کے ساتھ انھیں مٹتی ہوئی تہذیب کا دکھ بھی ہے جس طرح وہ ناول میں بیان کردہ عہد کے منظر نامے کو اپنی تمام تر معنویت کے ساتھ آشکار کر دیتی ہیں۔ مونا کے کردار کا ایک اور رُخ مصنفہ نے یہ دکھایا ہے کہ وہ بھیڑ میں بھی خود کو تنہا محسوس کرتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسے چیزیں اپنانے کا ڈھنگ نہیں آتا۔ یہی وجہ ہے کہ جب عائشہ اور افروز کے ساتھ ہوتی ہے تو بھی خود کو تنہا محسوس کرتی ہے:

> تو ان سب کے جھمگٹے میں وہ اکیلی کہاں تھی۔ مگر نہیں عائشہ اور افروز کے سامنے وہ ایک دم تنہا ہو جاتی کیونکہ عائشہ کے پاس تو پورا ہندوستان تھا اور اس کے پاس کچھ بھی نہیں۔ شاید یہ چیزیں چھن جائیں تو بہت زیادہ اپنی ہو جاتی ہیں۔ اب یہ لاہور کا شاہی قلعہ اور جہانگیر کا مقبرہ اور شالامار باغ یہ سب تو اس کے اپنے تھے، مگر بالکل بھی قابل تذکرہ نہ تھے۔ اُسے معلوم تھا کہ جب چاہے گی انھیں دیکھ لے گی۔

اور راوی، چپ چاپ ریلوے لائن اور جہانگیر کے مقبرے کے پار بہہ رہا تھا مگر چیزوں کو اپنانے کا ڈھنگ اُسے نہیں آتا تھا اور عائشہ یہاں کی ہر شے ایک ایک کر کے چھن رہی تھی۔[17]

پھر وہ عائشہ سے نور جہاں کے مقبرے کے بارے میں پوچھتی ہے کیونکہ اس کی شخصیت میں بھی تنہائی ہے اور اداسی دکھائی دیتی ہے:

وہ نور جہاں کے مقبرے تک تن تنہا پہنچ کر وہ شعر ہر گز نہ پڑھ سکتی تھی کہ برمزار ما غریباں۔ غریب کا مطلب غریب مفلس نہیں بلکہ مسافر اجنبی پردیسی ہے۔ وہ سوچتی اتنی بڑی ملکہ نے اپنے آپ کو کس طرح ایک اجنبی مسافر، پردیسی محسوس کیا ہو گا اتنے جاہ و جلال کی زندگی گزارنے کے باوجود یہ مسافری اور تنہائی اور انجانے راستے میں کھوئے جانا تو پھر آدمی کے اندر ہوتا ہے۔[18]

ناول میں ایک کردار مونا کی والدہ کا ہے جو مڈل پاس ہیں جب کہ ان کے خاوند ڈاکٹر ہیں۔ دونوں کے معیارات میں فرق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بیوی خاوند کے سامنے خود کو بہت چھوٹا محسوس کرتی ہے۔ ان دونوں کی بڑی بیٹی ایک اچھے گھرانے میں بیاہی گئی اور داماد بھی اچھا ثابت ہوا۔ چنانچہ ان کی خواہش ہے کہ مونا کے لیے بھی اسی طرح کے کسی اچھے رشتے کا انتظام ہو جائے۔ لیکن بد قسمتی سے ان کی یہ خواہش پوری نہیں ہوتی اُن کی یہ مایوسی اور خواہش کا پورا نہ ہونا ایک ناسٹلجیائی کیفیت کو ظاہر کرتی ہے، مصنفہ نے مونا کی والدہ کی کیفیت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

چل رہنے دے وہ ایک دم اُداس ہو جاتی ہیں۔ ابا کے سامنے انھیں اپنی سادگی بہت کھلتی، دل ہی دل میں ان کا اعتماد ڈھے چکا تھا۔ ابا کی مجلس پسندی اماں کو تنہا کر دیتی اور چپکے چپکے اپنی یادوں کے دفینے کھودتی رہتیں۔ آخری دنوں میں بالکل ہی ماضی میں جا بسی تھی۔[19]

غالدہ حسین ماضی اور حال کا تقابلی کرتی ہیں جب وہ میکے اور سسرال کا سوچتی ہیں تو وہاں بھی انھیں سسرال کی نسبت میکے کی یاد ستانے لگتی ہے۔ مصنفہ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ شاید عورت اپنے میکے کو کبھی بھول نہیں سکتی۔ میکے کی جدائی کا غم اُس کے دل سے کبھی نہیں جاتا۔ بیٹی قدرت کے اس نظام اور اس فیصلے کے آگے خود کو بے بس محسوس کرتی ہے۔ وہ اپنے بابل سے التجا تو کرتی ہے، اُسے دلیلوں سے قائل کرنے کی کوشش کرتی ہے کہ خدارا اُسے اپنے گھر سے بے دخل نہ کریں لیکن یہ تو قدرت کا قانون ہے یہاں آخر کار انسان کے پاس ان دلیلوں کا جواب یہی ہے کہ یہ اللہ کے فیصلے ہیں:

اُسے ہر حال میں رخصت ہونا ہی ہے۔ عورت کا یہ ازلی و ابدی غم، یہ سدا بہار دردِ جدائی، ہمیشہ سرسبز رہنے والا ناسٹلجیا نسل در نسل منتقل ہوتا جاتا ہے۔ یہ گھمبیر اداسی عورت کی اساس ہے۔ غم جس کا کوئی مداوا نہیں، آنسو جن کی کوئی اتھاہ نہیں۔ ایک گہرا دکھ جو بوند بوند جی جان کو گھلاتا ہے۔ ہجر و فرق، جدائی

بر پا، شاید فراق ہی زندگی کا اصل ہے۔ ہر شے کی ماہیت، بشنو جواز نے حکایت می کنیم، و زجدائی ھا شکایت می کنیم۔[۲۰]

ناول کا ایک اہم کردار حسن بھی ہے۔ حسن مونا کے لیے ہمدردانہ جذبات رکھتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ وہ لکھتی رہے کیونکہ وہ ایک اچھی مصنفہ ہے اس طرح وہ اپنے جذبات اور احساسات کا کتھارس کر سکتی ہے۔ وہ اس کی ہر لمحہ ہمت بندھاتا ہے کہ وہ اپنی تخلیقات کو جاری و ساری رکھے۔

خالدہ حسین کے ناول کاغذی گھاٹ میں سماجی اور مادی منظر نگاری دونوں دکھائی دیتی ہیں جن کا تعلق ماضی کی یادوں سے وابستہ ہے۔ مصنفہ ماحول کو قاری کے لیے اس طور سے واضح کر دیتی ہے کہ قاری اسی منظر میں سانس لینے لگتا ہے۔ ناول کا مرکزی کردار مونا ہے جو اپنے بچپن میں تحریکِ پاکستان، مہاجرین کی آمد اور مقامی لوگوں کی ہجرت میں اپنی تمام تر حساسیت کے ساتھ شریک ہے اور اپنی دوستوں عائشہ اور افروز کی وجہ سے نہ صرف احساسِ کمتری کا شکار ہے بلکہ اپنے آپ کو ان کا مجرم بھی گردانتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ یونی ورسٹی کی طالبہ بن جاتی ہے اور اس طویل عرصے میں اس کے گرد و پیش کی دنیا یکسر تبدیل ہو جاتی ہے کہ اس کا بچپن، اس کے دوست، پڑوسی مشاغل، میلے ٹھیلے، دل چسپیاں، علاقہ اور خاندان کے افراد بھی وقت کے ساتھ ساتھ ناول کے منظر نامے سے غائب ہو جاتے ہیں اور نیا ماحول اور لوگ ان کی جگہ لے لیتے ہیں۔ یہ تمام چیزیں مونا کی شخصیت اور ذہنی کیفیت کو پیچیدہ بنا دیتی ہیں۔ زندگی اس پر نئے سرے سے آشکار ہوتی ہے اور وہ تمام لوگ جو اسے کبھی احساسِ کمتری میں مبتلا کیے رکھتے تھے اور اس کی نفسیاتی الجھنوں کا باعث بنتے تھے۔ ان کا منطقی انجام اسے کرب میں مبتلا کر دیتا ہے۔ یوں ہر کردار کی کہانی اپنے اندر مسلسل اضطراب اور بے چینی لیے ہوئے ہے جس کے باعث ہر کردار ناسٹلجیا کا شکار نظر آتا ہے۔ مصنفہ نے مونا کو نہایت حساس کردار کے طور پر پیش کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر معاملے میں بہت حساسیت اور نرم گوشہ رکھتی ہیں۔ وہ اپنے سکول کے دور کو یاد کرتے ہوئے ایک ایک واقعہ بیان کرتی ہیں۔ سکول میں جب وہ کسی شاخ پر پھول کو مرجھایا دیکھتیں تو اس کے بے کار ہو جانے پر افسوس کرتیں:

بشر رازِ دلی کہہ کر ذلیل و خوار ہوتا ہے
نکل جاتی ہے جب خوشبو تو گل بیکار ہوتا ہے

اس کو خوشبو نکلے پھول کے بے کار ہونے پر اتنا صدمہ ہوتا کہ خوف کی اک لہر کمر میں چلنے لگتی۔ وہ تیزی سے نیچے اترتی تو کہیں بائیں جانب کے گیٹ کے ساتھ ساتھ کھٹے کے بار کے پیچھے سے وہ جھکا ہوا منحنی وجود وارد ہوتا۔ سلوٹوں بھرے پینٹ کوٹ اور قمیض میں ملبوس پینٹ جو ٹخنوں سے بے حد اونچی ہے اور جس میں کیلس لگے ہوئے ہیں جو بہت چھوٹے کر کے کندھوں پر گزرتے ہوئے قمیض کو گچھا کرتے

جاتے ہیں اور اوپر جھکی گردن کے ساتھ کمزور سا سانولا چہرہ۔ آنکھوں پر موٹے شیشوں اور کالے فریم کی عینک، ہونٹ لٹکے ہوئے جن کے کونوں سے اکثر نمی ٹپکتی رہتی تھی۔ رائے بہادر نمستے! وہ خاص طور پر دور سے بھاگی جاتی صرف ان کے گیلے ہونٹوں سے "نمستے نمستے" سننے کی خاطر۔ یہ سکول کے مالک رائے بہادر سوہن تھے۔[۲۱]

مونا اپنے سکول کے زمانے کے استاد کو یاد کرتی ہے تو اسے وقت کی تبدیلی کا احساس ہوتا ہے۔ وقت کی ناپائیداری کا احساس ہوتا ہے۔ اپنے دور، ساتھی اور ان کے ساتھ گزارے ہوئے لمحات کو یاد کر کے بیک وقت خوش اور اداس ہو جاتا ہے۔ یہ سب یادیں اُسے اُداسی اور تنہائی کا احساس دلاتی ہیں بقول ڈاکٹر اعجاز راہی:

خالدہ اصغر کے افسانوں کی تشکیل ان کرداروں سے ہوتی ہے جن کے چاروں طرف تنہائی، روحانی خلا، تہذیبی ابتری، بے سمتی اور لامرکزیت ایک دھند کی طرح شناخت کو متاثر کر رہی ہے۔ زندگی کی بے معنویت، اقدار کی پامالی اور موت کے شعور نے جس طرز احساس کو نمایاں کیا ہے وہ خالدہ حسین کے ہاں ارزاں ہے۔ یہ مقام حیرت، تجسس و جستجو کے نئے علائق وا کرتا ہوا خالدہ حسین کے ہاں اپنی ذات میں ڈوبنے کے عمل اور ذات میں تلاش کے عناصرِ ترکیبی کو ترتیب دیتا ہے۔[۲۲]

گذشتہ دور کے واقعات کو مصنفہ نے انتہائی خوب صورتی سے بیان کیا ہے۔ ماضی کی اقدار اور روایات کا ذکر ناول میں اس طرح کیا گیا ہے کہ ماضی میں لوگ کس طرح اپنی روایات سے جُڑے ہوئے تھے۔ دوستوں، رشتہ داروں عزیزوں کے ہاں محافل سجا کرتی تھیں۔ لوگ کہانیاں سنایا کرتے تھے۔ رات گئے تک رونقیں لگا کرتیں اور ہنسی مذاق ہوتا۔ چائے کی کیتلی صبح تک ٹھنڈی نہ پڑتی۔ آج کے دور میں یہ روایات ناممکن ہو گئی ہیں۔ زندگی کا پہیہ تیزی سے رواں دواں ہے۔ انسان مشین کی طرح کام کرتا ہے اور رات کو تھکا ہارا آ کر بستر پر لیٹ جاتا ہے۔ ہر کوئی مصروف نظر آتا ہے۔ ماضی میں لوگوں کے پاس مل بیٹھنے کا وقت تھا۔ جب کہ حال میں زمانہ بدل گیا ہے۔ دوسری جانب ٹیکنالوجی نے دنیا کو گلوبل ویلج بنا دیا ہے اور گھر بیٹھے رابطے ہو جاتے ہیں اور انٹرٹینمنٹ کے مواقع بھی میسر ہیں مگر ماضی کا شائق اپنے حال میں جی تو لیتا ہے لیکن ماضی اُس کا پیچھا نہیں چھوڑتا:

اس کے ساتھ معلوم نہیں کیسے اس کی اتنی گہری دوستی ہو گئی، ہاں کہانیوں سے اسے کتنی بے شمار کہانیاں آتی تھیں اور فرصت بھی اتنی کہ خوب دل لگا کر ہر پھیرے ایک نئی کہانی سناتا جو کسی انجام تک نہ پہنچتی بلکہ ایک اور کہانی کو چھو کر رُک جاتی جسے آئندہ پھیرے کے لیے رکھ لیا جاتا۔[۲۳]

ناول کا کردار راجہ راشد جو عصمت باجی کا منگیتر ہے مونا کو ناسٹلجیا میں مبتلا کر دیتا ہے۔ جب اُسے غائب ہوئے عرصہ گزر جاتا ہے راجہ راشد آئی این اے میں ملازم تھے مگر عرصہ ہوا اُن کی کوئی خبر نہ آئی۔ اس واقعے کو مصنفہ

نے یوں بیان کیا ہے۔

> بس ایک منظر شیشے سا ساکت ٹھہر گیا تھا۔ راجہ راشد معلوم نہیں کہاں تھے بس اُسے رفو باجی سے اتنا ہی معلوم ہوا تھا کہ وہ کسی بہت بڑی جیل میں بند ہیں۔ اُسے ان کی نازک سی سنہری عینک یاد آگئی۔ اُس کا جیل کی بھدی سلاخوں کے ساتھ کوئی رشتہ نہ بنتا تھا۔ اس پر ان کے تھیکے نقوش پھر آئی این اے کے حروف بڑی خوف ناک صورتیں بنا کر اُس کی آنکھوں کے سامنے ناشتے۔ وہ یکایک جیل کی سلاخوں میں ڈھل جاتے۔ [۲۴]

ناول میں آگے چل کر مصنفہ سانحہ مشرقی پاکستان کا ذکر کرتی ہیں۔ اس کی تصویر کشی بھی مصنفہ نے بڑے اچھے انداز میں کی ہے

> افروز کے صبح شام کے الٹی میٹم اُسے واقعی پریشان کرنے لگے تھے۔ چاروں طرف گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ فضا پہ عجیب افسردگی طاری تھی۔ الیکشن ہو چکے تھے اور اسمبلی کے اجرا کا انتظار تھا مگر فضا میں لہو کی بُو تھی۔ سب کچھ تاریک مایوسی میں ڈول رہا تھا۔ [۲۵]

تقسیم ہند کا واقعہ کوئی معمولی نوعیت کا واقعہ نہیں ہے۔ اس کے بیان میں خالدہ حسین نے وہ کمالِ مہارت دکھائی ہے کہ کوئی بھی تبدیلی نظر انداز کیے معاشرے کی بدلتی صورت حال کو ناول میں نہایت اختصار کے ساتھ سمو دیا ہے۔ گویا کوئی تشنگی کا احساس نہیں ہوتا۔

ایک روایت چلی آرہی ہے کہ ادیب قیام پاکستان سے متعلق ادب میں ہجرت سے پہلے یا بعد کی باتیں کرتے ہیں اور اس واقعے کو عموماً سیاسی پسِ منظر میں پیش کرتے ہیں لیکن خالدہ حسین نے اس ناول کو عام انسان یا فرد (مونا) کی حیثیت سے لکھا ہے۔ اگر ناول میں موضوعات کے حوالے سے جائزہ لیا جائے تو نوزائیدہ ریاست کے معاملات، تعصبات اور معاشرتی مسائل تو دیکھنے میں آتے ہی ہیں ساتھ ہی مونا کے اپنے ذاتی تاثرات بھی حاوی نظر آتے ہیں۔

مونا کا پرانا گھر، اس کا آنگن، ماحول، ابتدائی گھریلو تعلیم، خاندان کے باقی افراد، گھریلو تعلقات، روایات، دوستوں کا برتاؤ، اساتذہ کا کردار، تعلیمی اداروں کا ماحول، تاریخی واقعات اور تضادات، ہندو مسلم تقاضوں کا افتراق، دو قومی نظریہ، قائد پرستی، مہاتما گاندھی کا قتل، زمینوں اور انسانوں کا تقسیم ہونا، مہاجرین کی آمد، مقامی لوگوں کی ہجرت، نیا ماحول، نیا علاقہ، تہذیبوں کا تصادم اور مٹ جانے کا نوحہ، زبان کی تبدیلی، رسوم و رواج، شادی بیاہ، ثقافت، میلے ٹھیلے۔ یہ تمام مناظر مونا اپنی آنکھوں سے دیکھتی ہے جس میں لگ بھگ تیس برس کا عرصہ محیط ہے۔ یہ تمام خارجی واقعات جب اُس کے داخل میں منتقل ہوتے ہیں تو وہ بے چین ہو جاتی ہے اور اُداسی، مایوسی اور تنہائی جیسے عناصر اس کے وجود میں سمٹ جاتے ہیں۔

یہ تاریخ کا اہم دور ہے۔ دو غیر معمولی واقعات اس دوران پیش آئے یعنی پاکستان کی تخلیق اور سقوط ڈھاکہ۔ کاغذی گھاٹ میں پاکستان کے سارے معاملات، تضادات، کامیابیاں، ناکامیاں، عروج اور زوال اور اس قوم کو درپیش مسائل زیرِ بحث آتے ہیں۔ تقسیم سے پہلے تعلیمی اداروں میں پڑھائے جانے والے ہندو اور مسلم نصاب اور ان میں پیش آنے والے تاریخی واقعات کے تضادات اور تعصبات۔ دونوں کلچرز کے ٹیچر اور طلبہ کے رویوں کا فرق اور پاکستان بن جانے کے بعد کی صورتِ حال، پاکستان کی تخلیق، قائدِ اعظم کی تقریر، مصطفی ہمدانی کی صدیاں پلٹنے والی آواز یہ ریڈیو پاکستان ہے۔ نئی نسل میں فیض اور ساحر کی مقبولیت فیصل آباد، لاہور اور دیگر شہروں کے عجیب عجیب اور لوگوں کی آمد۔ ایک خاص علاقے سے آنے والے مہاجر کنبوں کا تہذیبی تفاخر اور مقامی تہذیب، زبان اور رہن سہن پر ان کے اثرات، دہلی، لکھنو، علی گڑھ اور آگرہ کے قصبے، مسلم تہذیب کی پُر شکوہ عمارت اور تاج محل، لال قلعہ، قطب مینار جیسی تاریخی نشانیاں چھوٹنے کا غم۔ مونا کا کچی املی کی پھلیاں اور کتارا دیکھ کر پریشان اور یہ جان کر احساس کمتری میں مبتلا ہونا کہ کچن کی جالی والی جس الماری کو وہ ڈولی کہتی ہے اسے عائشہ لوگ گنجینہ اور نعمت خانہ کہتے ہیں۔ یہ تمام ایسے واقعات ہیں جو مونا کو بے چین کر دیتے ہیں۔ ماضی کی یہ تمام رفاقتیں اسے دکھ اور کرب میں مبتلا کر دیتی ہیں۔ احساسِ کمتری اور بے یقینی اُسے مایوسی کا شکار کر دیتی ہیں۔

کاغذی گھاٹ ناول کل گیارہ ابواب پر مشتمل ہے۔ ہر باب اپنی کہانی اور کرداروں، واقعات میں ناسٹلجیا کی بھرپور پیش کش لیے ہوئے ہے۔

ہجرت کا کرب اور ماضی کی یادیں ہر فرد کو اذیت میں مبتلا کر دیتی ہیں۔ پھر وہ ایک دم المناک ہو جاتی اور اپنی زمین اور گھر چھوڑنے اور سہیلیوں سے بچھڑنے اور رشتہ داروں سے کٹنے کی داستان سنتے سنتے اس کے دل میں آنسوؤں کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگتا۔

یہاں مرکزی کردار مونا کے ہاں حساسیت کا عنصر دیکھنے میں آتا ہے جو کہ ناسٹلجیا کی ایک شکل ہے:

> تب گرامی کے موسم میں باہر لان میں پیڈسٹل فین لگا کر سوتے تھے۔ ہرے بھرے وسیع لان میں قطار سے چارپائیاں خود بخود بچھ جاتیں جن پر صاف ستھرے بستر جگمگاتے اور وہ پنکھا بھی ہر رات خود بخود وہاں پہنچ جاتا اور صبح اُٹھ جاتا۔ سب اپنے اپنے بستر پر ٹھنڈی چاندنی تلے بے تحاشہ خواب دیکھتے جب کہ اوس چپکے چپکے گرتی رہتی۔ رات کے وقت کوئی مہمان آ جاتا تو وہیں پر کرسیاں ڈال دی جاتیں۔ چاندنی میں مہمان داری ہوتی۔ اماں کے چچازاد بھائی جنہیں وہ سب مجید ملٹری کہتے تھے، بس رات کو ہی آتے وہ کبھی فوج میں رہ چکے تھے اور اب ان کی وجہ شہرت لمبی لمبی گپ چھوڑنا تھا۔ ایسی مبالغہ آمیز باتیں کرتے۔ اتنے خلوص کے ساتھ کرتے کہ بڑے بچے سب ان کے سحر میں آ جاتے۔ رات کا جادو

اور بھی گہرا ہو جاتا۔ پھر خواب اور حقیقت کا سلسلہ مٹ جاتا.....ذرا دن چڑھ جاتا تو اوس کا ہر قطرہ سورج کے ساتھ رنگ منعکس کرتا ہر طرف نگینے بکھر جاتے۔

مگر سب کچھ خود ہی ہوتا چلا جاتا۔ اسی لیے اُسے کتابیں پڑھنے اور کھیلنے اور لوگوں سے محبت کرنے اور باقی وقت اپنے آپ میں ڈوبے رہنے کے علاوہ کچھ بھی نہ کرنا ہوتا۔ شاید اسی لیے اس کا ذہن جسم سے الگ ہو گیا تھا۔ اور یہ دوئی اس کو دولخت کرنے کے لیے بہت تھی۔[۲۶]

اس اقتباس میں ماضی کے دور کی منظر کشی کی گئی ہے۔ جب گرمیوں میں لوگ پیڈسٹل فین لگا کر صحن میں سویا کرتے تھے۔ اتفاق تھا سب میں اور محبت تھی۔ مل بیٹھنے کا شوق ہوتا، اس دوران گپ شپ ہوتی۔ لوگوں سے حال احوال پوچھا جاتا تھا۔ اس کے برعکس حال کا تقابل جب کیا جاتا ہے تو آج کے مادیت پرست دور میں یہ تمام چیزیں ناپید نظر آتی ہے۔ لوگوں کے پاس نہ وقت ہے اور نہ پرانے لوگوں جیسی محبت۔ اگرچہ آج کا انسان جدید آسائشوں سے ہمکنار ہے۔ پر تعیش زندگی بسر کرتا ہے لیکن ماضی کی اقدار اور روایات سے کبھی غافل نہیں رہ سکتا۔ ماضی اسے ہانٹ کرتا ہے اور یہ ایک فطری عمل ہے۔

ناول کا کردار مونا گزرے پل کو جب یاد کرتی ہے تو اسے ہجرت کر کے نئے گھر میں مقیم ہو جانا یاد آتا ہے مثلاً:

اب وہ نئے گھر میں جم گئے تھے اور بہت سی چودہ اگتیں آئیں اور نگل گئیں اور بہت ذوق و شوق کے ساتھ چراغاں ہوئیں اور کاغذ کے چھوٹے چھوٹے پرچم لگائے اور لہرائے گئے۔ اس گھر کی بو باس اس کا حصہ بن گئی۔ جنتر منتر کی باڑ اور اس میں لگنے والے چھوٹے چھوٹے پھول اور اپنے موسم میں کھلنے والی بینگنی اور زرد بڑے بڑے پنیری اور پوری پوری باڑ کی صورت میں اُگنے والے سویٹ پنیر، بند تتلیوں ایسے بے شمار رنگ۔ وہ سمجھتی بس رنگ اب ختم ہو گئے۔ اب اور کہاں سے آئیں گے.....چاروں سمت رنگ تھے اور خوشبو اور دسمبر کی دھوپ کی تمازت یا پھر برسات کی تیز بوچھاڑ اور طوفانی ہواؤں میں جھولتے قدیم و عظیم درخت اور بجلی کی دل دہلاتی کڑک۔ اس کارواں رواں زندہ ہو کر اس لامحیط کائنات کے ساتھ منسلک ہو جاتا۔ کانپتا، لرزتا کچھ نظر آتے آتے رہ جاتا۔ کچھ ہوتے ہوتے رہ جاتا اور اس کے بعد ایک طویل خاموشی سکوت کا وقفہ، اتھاہ اُداسی، کیا عائشہ اور افروز بھی یہ سب کچھ دیکھتی اور محسوس کرتی ہیں۔ وہ سوچتی، مگر ان کی بے خوف اور مضبوط ذات سے سب کچھ کتنا دور لگتا۔[۲۷]

مونا کا کردار مستقل طور پر ناسٹلجیا میں ڈوبا ہوا ہے، مونا ہر بات کو اس کی تہ تک سوچتی ہے۔ نہایت حساس ذہن کی مالک ہے۔ جب وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ اپنا تقابل کرتی ہے تو اُسے یہ احساس ہوتا ہے اور وہ یہ سوچتی ہے کہ

عائشہ اور افروز کتنی خوش قسمت ہیں کہ دو حصوں میں نہیں بٹی ہوئیں۔ وہ دوسروں پر تنقید کرتیں، ان کے ہاں کوئی تضاد نہیں لیکن اس کا اپنا وجود، بہت الجھا دینے والا ہے:

> آہستہ آہستہ سب کچھ معدوم ہوتا جا رہا تھا اور دنیا دو حصوں میں بٹ رہی تھی۔ میرا تمھارا، بڑا چھوٹا، طاقتور کمزور، ہونا نہ ہونا، عمل سوچ، دو انتہاؤں نے اس منحنی وجود کی کھینچا تانی شروع کر رکھی تھی۔ اسے اپنا آپ ٹوٹتا محسوس ہوا۔ اسے عائشہ اور افروز پر حیرت ہوتی جن کے کوئی تضاد، کوئی مسائل نہ تھے جو اتنے مزے سے دوسروں پر تنقید کرتیں اور مطمئن رہتیں۔[۲۸]

اسی طرح ایک اور موقع پر مونا جب اپنی سہیلیوں کی زندگی ان کے سٹائل اور ان کے کلچر کو دیکھتی ہے تو بار بار احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتی ہے اُسے ان سے اپنا تقابل کرتے ہوئے مایوسی کے کرب سے گزرنا پڑتا ہے۔ ناول میں سب سے نمایاں ناسٹلجیا کا شکار یہی کردار ہے جو ہر موقع پر، ہر جگہ پر اپنا اور اپنی سہیلیوں کا موازنہ کرتی نظر آتی ہے۔ جولائی اگست میں جب بارشیں ہوتی ہیں تو اس کا سارا منظر مونا کو ماضی کی طرف لے جاتا ہے اور وہ بیتے ہوئے لمحوں کو اس طرح یاد کرتی ہے کہ اس منظر کا ہر ایک گوشہ، ہر ایک تصویر آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے۔ بارش کے منظر کو دیکھتے ہوئے وہ ان کی موج مستیوں کا ذکر کرتی ہے:

> افروز کا گھر عین سیلابی علاقے میں تھا۔ وہ سیلاب میں گھر کی چھت پر بیٹھی طویل خطوط میں سیلاب نامہ لکھتی رہی جو پانی اترنے کے بعد ڈاک میں اسے ملے۔ کتنا تنوع کتنا ایڈونچر تھا ان لوگوں کی زندگی میں۔ یہاں آ کر انھوں نے یہاں کے دریا و سیلاب اس میں ڈوبی بارہ دریاں اور چوبرجیاں پوری کی پوری تاریخ اپنے ہاتھوں میں لے لی تھی جب کہ وہ خود اسی طرح کسی کیپسول میں محفوظ بیٹھی شیشے میں زندگی کے عکس دیکھ رہی تھی۔[۲۹]

ناول میں مصنفہ نے ۱۹۶۵ء کی جنگ کا موازنہ ۱۹۷۱ء کی جنگ سے کیا کہ اس دسمبر کی جنگ ویسی نہ تھی، اب کہ کوئی بم پکڑ کر پانی میں پھینکنے والا نہ تھا، اب لائٹ بند کر دو کی آواز نہ آتی تھی، مشرق و مغرب میں کوئی رابطہ نہ تھا، حالانکہ اب بھی وہی کچھ ہو رہا تھا کہ:

> گاڑیوں پر مٹی کے لیپ بھی ہوئے اور خون کے عطیات دینے کے لیے ہسپتالوں میں قطاریں بھی لگیں۔ مگر کچھ تھا کہ دل مر گیا، کسی کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا، مشرقی بازو میں کیا ہو رہا ہے۔ سب انتشار تھا اور بے یقینی مکتی باہنی کے مظالم کی داستانیں ادھر مغرب میں پہنچ رہی تھیں۔[۳۰]

ایسے میں مونا کو وہ باتیں بھی یاد آتی ہیں جو متحدہ پاکستان میں تھیں:

> وہ فردوسی بیگم کی بھٹیالی اور شہناز بیگم کی سوہنی دھرتی کیا ہوئے۔ عالم گیر کا میگھارے میگھا۔ بنگلہ

تھیٹر ٹروپ جس میں "ردائے خواب" بُنی جاتی تھی۔[۳۱]

تقسیمِ ہند کا جب واقعہ ہوا تو زمینی تقسیم کے ساتھ انسانی تقسیم نے لوگوں سے ان کی پہچان چھین لی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ جو ہجرت کر کے آئے، جب انھیں ایک بار پھر ہجرت کرنا پڑی تو وہ اپنے وجود کے وہم میں گرفتار ہو گئے۔ ایسی صورت حال میں ناسٹلجیا کا جنم لینا ایک فطری امر تھا جس کا اظہار مصنفہ نے بڑی خوب صورتی سے کیا ہے:

> تو پھر آپ خود بھی ناممکن ہیں۔ بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔ ہاں اس میں کیا شک ہے۔ اسی لیے ہر کوئی اپنے وجود کے وہم میں گرفتار ہے جہاں ٹھوس زمین پر قدم ہوں وہاں ایسے واہمے نہیں ابھرا کرتے۔ دیکھو بی بی جہاں لاکھوں کروڑوں کی، چچیاں، پھپھیاں، ساس اور خلیری بہنیں اور اچھن صمن بھائی سرحد کے پار ہوں گے وہ اپنی محبت تقسیم کرنے کا پورا حق رکھتے ہیں۔ دراصل بات یہ ہے کہ ہماری ایک مشترکہ تہذیب تھی، بڑے فطری طریقے پر پروان چڑھ رہی تھی، اسے جب غیر فطری طریقے پر روک دیا گیا، تو یہ انتشار تو پیدا ہونا ہی تھا۔[۳۲]

مندرجہ بالا اقتباس تقسیم کے بعد پیدا ہونے والی صورت حال اور اس کی بدحالی کو ظاہر کرتا ہے جو حالات تقسیم کے بعد لوگوں کو سہنے پڑے، اپنے عزیز و اقارب سے بچھڑنے کا غم، اپنی زمین، اپنے وطن سے دوری، تہذیبوں کا ٹوٹ پھوٹ جانا، محبتوں کی تقسیم یہ سب وہ عوامل تھے جو انتشار کا باعث بنے۔ ایسے میں شناخت کا مسئلہ جڑوں کی تلاش ایک خطرناک بات ہے:

> لوگ اپنی جڑوں کی تلاش میں چل نکلے۔ بڑی خطرناک بات ہے۔ یہ مراجعت کا سفر، الیکس ہیلی نے روٹس کیا لکھی، ہر طرف ناسٹلجیا کا حملہ ہو گیا..... ہم اپنی تاریخ آزادی ۱۷ سے شروع کرتے ہیں جب ہم نے تم لوگوں سے نجات پائی، ہمیں تم لوگوں سے نفرت ہے۔ میری بیٹی فوجی دیکھ کر ہسٹرک ہو جاتی ہے۔[۳۳]

بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ کسی چیز، شخص، جگہ یا واقعہ کے ساتھ بہت سے دوسری ایسی ہی چیزوں کی ایسوسی ایشن ہوتی ہے۔ مونا کے ساتھ بھی یہ ایسوسی ایشن والا معاملہ ہوتا رہتا ہے۔ وہ جب ایک چیز یا واقعہ کا تصور کرتی ہے تو اسے اس سے جُڑے کئی اور خیالات یاد آتے ہیں جب وہ شفیق الرحمٰن کے گھر اور ان کی فیملی کو دیکھتی ہے:

> کراچی اس کے لیے دوسری دنیا تھا مگر ایک دیوار بیچ والے ہمسائے ڈاکٹر شفیق الرحمٰن اور ان کی خوب صورت بہن، پین آپا کے بہت سے عزیز و اقارب کراچی میں مقیم تھے اور ان کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ اسے اکثر اپنے ساتھ کا یہ گھر زیدی چچا کے گھر کی یاد دلاتا۔ وہی رشتہ داروں کی بھرمار، تخت پر بیٹھی ڈاکٹر صاحب کی والدہ پاندان کھولے ہر دم ڈلی کاٹتی رہی۔ پین آپا صبح سے شام تک باورچی خانے میں جتی

رہتیں۔ سل پر مسالے پستے اور ادرک لہسن کی اشتہا انگیز خوش بو چاروں سمت پھیلی رہتی.....

تب باورچی خانے گھروں سے باہر ہوتے تھے۔[۳۴]

ناول کی واحد متکلم کے مزاج اور طبیعت میں بے حد حساسیت پائی جاتی ہے۔ وہ معاشرے میں جب بھی کوئی بگڑی ہوئی صورتِ حال دیکھتی ہے تو ناسٹلجیک ہو جاتی ہے۔ اس طرح وہ جب دسمبر کی طویل سرد راتوں کا تصور کرتی ہے تو اُسے اپنی گرم نرم لحاف کے ساتھ ان لوگوں کا خیال آتا ہے جو اس بے رحم موسم میں باہر ٹھٹھر رہے ہوتے ہیں اور جن کی جھونپڑیاں برفانی ہواؤں کے ساتھ تنکا تنکا بکھر رہی ہوتی ہیں اور وہ عورتیں جو مدقوق چہروں اور پھولے پیٹوں کے ساتھ گھر گھر جھوٹے برتن دھو دھو کر اور کچرے سمیٹ سمیٹ کر ادھ موئی، بلبلاتے، ناک ٹپکاتے برہنہ بچوں کی منڈلی میں واپس جھونپڑوں میں پہنچتی ہوں گی اور جہاں غلیظ دانتوں اور چیکٹ بالوں اور جھاڑ دار داڑھیوں والے مرد کھانے اور بیوی کے انتظار میں دانتوں میں خلال کرتے ادھر ادھر تھوکتے کوستے اور گالیاں بکتے ہیں:

> معاشرے کی اس ساری صورت حال کے سامنے وہ بے بس تھی کیوں کہ وہ منافق تھی اور کہیں دل ہی دل میں اس روایت سے محبت بھی کرتی تھی اور اس میں اپنے آپ کو محفوظ بھی محسوس کرتی تھی۔ اس کے ساتھ الوہیت کے رشتے میں بھی منسلک تھی، صرف افروز سچ تھی اور عائشہ سچ تھی، جنھیں اپنے مقصد کے بارے میں کوئی شک وشبہ نہ تھا۔[۳۵]

روایتوں سے جڑا رہنا ناول کی واحد متکلم کا مزاج ہے۔ وہ تسلسل کی آرزو رکھتی ہے۔ اپنی روایتوں میں زندہ رہنا اور ان کے ساتھ جڑے رہنے کی متقاضی ہے۔ اس لیے وہ موجود کی مادہ پرست دور سے انحراف کرتی ہے۔ وہ اس دور میں رہتے ہوئے اس دور کے غیر اخلاقی رویوں سے شدید بغاوت کرتی ہے۔

ناول کی واحد متکلم اپنی دوستوں عائشہ اور افروز کی وجہ سے نہ صرف احساسِ کمتری کا شکار ہے بلکہ اپنے آپ کو ان کا مجرم بھی گردانتی ہے۔ اس کے کردار میں جابجا بزدلی، حساسیت، احساس جرم، تنہائی، خوف اور نفسیاتی مسائل نظر آتے ہیں۔ اس لیے وہ ہر جگہ اپنا اور اپنی سہیلیوں کا تقابل کرتی نظر آتی ہے:

> میری پیاری دوست، تم اپنے تمام تر خوابوں کے ساتھ انتہائی بزدل ہو۔ اور اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔ صدیوں کے بیمار سوشل نظام نے تمہاری رگ وپے میں بزدلی بھر دی ہے۔ شاید یہ تمہاری وراثت میں ہے۔ تم اس سے نکل نہ پاؤ گی۔ عائشہ ایک بہادر لڑکی ہے۔ بغاوت کرنا جانتی ہے۔ زندگی بدل سکتی ہے مگر اس کا رُخ غلط ہے۔ وہ بے وقوف بورژوا بننے کے چکر میں ہے۔ اونچی اڑان کی تیاری کر رہی ہے۔ اور میں اس کے لیے بے حد فکر مند ہوں۔ مگر تم؟ تم تو اس طرح ایک انتہائی بے کار، بے مقصد اور بزدلانہ زندگی بسر کر کے اس دنیا سے رخصت ہو جاؤ گی۔ انسان وہ ہے جس کے دم سے اس

کے ماحول میں، اس کے معاشرے میں بہتری کے لیے تبدیلی آئے۔ اصل یہی زندگی ہے۔ مجھے یوں
تمہارے ضائع ہو جانے کا دکھ ہو گا۔[۳۶]

افروز ناول میں وہ کردار ہے جو انقلابی خیالات کا حامل ہے۔ وہ ہر تعصب، فکری حد بندی اور مذہبی بندش سے آزاد، مارکسیت کی حامی ہے اور سرتاپا سچ اور شجاعت کی ایک مثال ہے جو اپنی دھن کی پکی ہے۔ اس کو مونا کی بہت فکر ہوتی ہے کہ وہ بے مقصد اور بے کار زندگی گزار رہی ہے کیونکہ اس کی ذات میں بزدلی ہے جبکہ اس کی مد مقابل دوست عائشہ ایک بہادر لڑکی ہے وہ زندگی بدلنا جانتی ہے۔ اس میں منفی رویوں کو رد کرنے کی صلاحیت ہے۔ اس لیے افروز مونا کے لیے فکر مند ہوتی ہے کہ وہ اپنے روایتی سوشل نظام سے خود کو نکالے اور اس روایتی خول کو اتار پھینکے جس نے اسے نفسیاتی طور پر مفلوج کر دیا ہے۔ ناول میں مونا کی ماں کے کردار میں بھی ناسٹلجیا ظاہر ہوتا ہے جب وہ مونا کی شادی کے لیے فکر مند ہوتی ہیں:

ایک تشویش اور اتھاہ اُداسی تھی جیسے مرغی چوزوں کو اپنے پروں تلے چھپا لیتی ہے، اماں اسی طرح اسے
اپنی نگاہوں میں چھپا لیتی ہے۔ ایک غم انھیں اندر ہی اندر چاٹ رہا تھا۔ عفت ایسا رشتہ کہاں سے ملے
گا۔ وہ بہت دفعہ اپنے قریبی لوگوں سے کہتے پکڑی گئی۔[۳۷]

بیٹی کی جدائی کا غم اور اس کی شادی کی فکر مند ماں کے دل میں ایک تشویش اور اداسی کی لہر دوڑتی دکھائی دیتی ہے۔ اس کو اپنی آغوش میں چھپا کر سوچتی ہے کہ ایسا تحفظ اور سکھ چین جو اُسے والدین کے گھر میں میسر ہے۔ وہ کہاں ملے گا۔ وہ کئی بار رشتہ کرانے والی خواتین سے اس کی شادی کے متعلق بات کیا کرتیں اور یہ غم ان کے لیے ایک اُداسی اور کرب کی شکل اختیار کرتا چلا جاتا ہے اور ویسے بھی یہ غم یہ کرب تو صدا کا ہے۔ ہر ماں باپ اور ہر بیٹی اس کرب اور دکھ سے گزرتی ہے۔

مجموعی طور پر ناول میں ناسٹلجیا بدرجہ اتم موجود ہے جس کی جھلکیاں پورے ناول میں نمایاں طور پر دیکھی اور محسوس کی جا سکتی ہیں۔ اس کے ساتھ مختلف جگہوں پر علامتی پیرائیہ اور استعاراتی انداز بہت متاثر کن ہے۔ اس ناول میں ہماری معاشرت میں منافقت، خود غرضی اور مادیت پرستی کی جانب اشارے کیے گئے ہیں۔ مونا سنجیدہ ذہن کی مالک ہے اور اس کے سامنے پاکستان کے تمام سیاسی، معاشرتی اور معاشی بحران ہیں اور یہ تمام واقعات اسے سوچ میں مبتلا رکھتے ہیں۔ ناول کے آخر میں مونا اپنے مخصوص عالمانہ خیالات کے ساتھ زندگی کے چیلنجز کا مقابلہ کرتی نظر آتی ہے۔

تاہم ناول میں ناسٹلجیا کا رجحان غالب نظر آتا ہے۔ انسان اور چیزیں واقعات کی طرح گزرتی چلی جاتی ہیں۔ کچھ بھی اپنی اصل صورت میں موجود نہیں رہتا۔ آدمی انفرادی، اجتماعی اور خارجی و باطنی سطحوں پر بیک وقت زندگی

گزارتا ہے اور یہی کش مکش اس کے ہاں ناسٹلجیا کو جنم دیتی ہے۔ مصنفہ کا خود بھی یہی نظریہ ہے کہ ماضی ہی تو آدمی کی یادداشت اور اس کا اصل وجود ہے، یادیں ہی انسان کو لازوال کر سکتی ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ بی بی امینہ، خالدہ حسین: شخصیت اور فن (اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۱۲ء)، ص ۴۷۔

۲۔ ممتاز احمد خان، آزادی کے بعد اردو ناول کی ہیئت، اسالیب اور رجحانات (کراچی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۹۷ء)، ص ۲۹۸۔

۳۔ بی بی امینہ، خالدہ حسین: شخصیت اور فن (اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۱۲ء)، ص ۴۷۔

۴۔ خواجہ حسن، نظامی، سی پارہ دل (دہلی: دروپش پریس، ۱۳۳۴ھ)، ص ۱۱۲۔

۵۔ خالدہ حسین، کاغذی گھاٹ (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء)، ص ۶۔

۶۔ ایضاً، ص ۶۔۷۔

۷۔ ایضاً، ص ۸۔

۸۔ ایضاً، ص ۸۔

۹۔ ایضاً، ص ۴۔۵۔

۱۰۔ ایضاً، ص ۱۲۔

۱۱۔ ایضاً، ص ۱۲۔

۱۲۔ ایضاً، ص ۵۔

۱۳۔ ایضاً، ص ۳۳۔۲۵۔

۱۴۔ ایضاً، ص ۵۵۔

۱۵۔ ایضاً، ص ۴۰۔

۱۶۔ ایضاً، ص ۳۸۔

۱۷۔ ایضاً، ص ۴۷۔

۱۸۔ ایضاً، ص ۴۸۔

۱۹۔ ایضاً، ص ۸۳۱۔

۲۰۔ ایضاً، ص۲۹۔

۲۱۔ ایضاً، ص۲۴۔

۲۲۔ اعجاز راہی، "پاکستان میں ناول"، مشمولہ اظہار (راولپنڈی: دستاویز پبلشرز، ۱۹۴۹ء)۔

۲۳۔ خالدہ حسین، کاغذی گھاٹ (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء)، ص۶۔

۲۴۔ ایضاً، ص۲۲۔۲۳۔

۲۵۔ ایضاً، ص۹۴۔

۲۶۔ ایضاً، ص۴۱۔

۲۷۔ ایضاً، ص۴۱۔

۲۸۔ ایضاً، ص۴۵۔

۲۹۔ ایضاً، ص۴۸۔

۳۰۔ ایضاً، ص۹۵۔

۳۱۔ ایضاً، ص۹۴۔

۳۲۔ ایضاً، ص۹۸۔۹۹۔

۳۳۔ ایضاً، ص۳۳۔

۳۴۔ ایضاً، ص۵۵۔

۳۵۔ ایضاً، ص۵۷۔

۳۶۔ ایضاً، ص۶۳۔

۳۷۔ ایضاً، ص۶۴۔

باب چہارم:

خالدہ حسین کے ناول کاغذی گھاٹ میں (شعور و آگہی سے لاعلمی کا دور/پروسٹن ناسٹلجیا) کے تناظر میں مطالعہ

شعور و آگہی سے لاعلمی کا دور/پروسٹن ناسٹلجیا:

ناسٹلجیا ایک فطری رویہ ہونے کے ساتھ ساتھ انسانی شخصیت کے ذہنی و باطنی رجحانات کا بھی عکاس ہے۔ ناسٹلجیا کا شعور مثبت اور منفی دونوں حوالوں سے انسانی فکر کو متاثر کرتا ہے۔ ایک طرف یہ رجحان فرد کو ماضی پرست بناتا ہے اور وہ بیتے دنوں کی یادوں اور مشاغل میں پناہ گزیں ہو کر حال کی تلخیوں سے کنارہ کشی اختیار کرنے کی کوشش کرتا ہے، جب کہ دوسری طرف یہ رجحان ماضی کے تجربات کی روشنی میں انسانی زندگی کو زیادہ بہتر اور تعمیری بنانے کا حربہ ہے۔ ہر دو صورتوں میں یہ رجحان اردو شعرا اور ادبا کی تحریروں کا حصہ بنتا رہا ہے۔ ایک طرف غالب نے یادِ ماضی کے عذاب سے گلو خلاصی کے لیے اپنے حافظے کے چھن جانے کی خواہش کا اظہار کیا ہے، جب کہ دوسری طرف ساغر صدیقی بیتے لمحات کی لہروں کی واپسی کے منتظر ہیں۔

یہ انسانی فطرت ہے کہ اُسے برے سے برا ماضی بھی خوش گوار محسوس ہوتا ہے جب کہ خوش حال، حال بھی ناگوار محسوس ہوتا ہے، تاہم اس افسردگی میں بھی ہمیں زندگی کی دائمی قدروں کا خوب صورت پیغام ملتا ہے۔

خالدہ حسین کے ناول کاغذی گھاٹ میں بھی ماضی پسندی کی یہ ملی جلی صورتیں نظر آتی ہیں۔ اس ناول میں ناسٹلجیا اور خود سوانحی رجحان آپس میں گھلے ملے ہوئے ہیں۔ ناول ہیروئن مونا کے حوالے سے پرانے ماحول کی یاد نگاری اور ناسٹلجیائی کیفیات قاری کی سوچ کے لیے اہم ہیں۔ ناسٹلجیا اس ناول کا غالب رجحان ہے۔ اس ناول میں ہماری معاشرت میں منافقت، خود غرضی اور مادیت پرستی کی جانب اشارے کیے گئے ہیں۔ مونا سنجیدہ ذہن کی مالک ہے، اور اس کے سامنے پاکستان کے تمام سیاسی و معاشی بحران ہیں اور یہ تمام واقعات اُسے سوچ میں مبتلا رکھتے ہیں۔ ناول میں شروع سے آخر تک ناسٹلجیا غالب نظر آتا ہے۔

مونا کے علاوہ اس ناول کے دو اہم کردار عائشہ اور افروز ہیں جن کے ذریعے خالدہ حسین نے دو اہم طبقوں کی عکاسی کی ہے۔ ہجرت کر کے آنے والے کھاتے پیتے اور مہذب خاندان کی لڑکی عائشہ شکل و صورت میں سب سے

آگے تھی اور کالج پہنچتے ہی کیا سے کیا ہو گئی تھی۔ اس کے علاوہ کئی دوسرے کردار بھی ہیں، جن کے ہاں اپنی اپنی نوعیت کا ناسٹلجیا ہے۔

خالدہ حسین کے ناول کاغذی گھاٹ میں ناسٹلجیا کی کئی صورتیں سامنے آتی ہیں، جن میں یاد، اداسی، تنہائی، گزرا پل، جڑوں سے کٹ جانا، ماضی کی یاد دلانے والی اشیاء، احساس زیاں، خود کو دہرانے اور خوابوں میں زندہ رہنے کی خواہشات، دوستوں اور قریبی رشتوں کا بچھڑ جانا، توقعات کے خلاف واقعات کا ہونا، خواہشات کا پورا نہ ہونا اور حساسیت۔ یہ تمام عناصر ہیں جو کہ مصنفہ کے شعور میں ناسٹلجیا کا سبب بنتے ہیں۔

کسی بھی معاشرے کی تصویر اس وقت تک مکمل نہیں ہوتی، جب تک ماضی کے کٹے ہوئے حصے اس کے ساتھ مل نہیں جاتے۔ اسی طرح انسانی شخصیت بھی اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی، جب تک ماضی کے کٹے ہوئے حصے کو تخیل کی مدد سے واپس لا کر ذات میں سمویا نہ جائے، گویا افراد کا تشخص ان کے ماضی میں چھپا ہوتا ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر قمر رئیس کا کہنا ہے کہ:

> قوموں کا تہذیبی تشخص ان کی تاریخ اور افراد کا تشخص ان کے ماضی میں پنہاں ہوتا ہے۔[1]

یادداشت انفرادی اور اجتماعی تشخص کی بنیاد ہے، یادداشت نہ ہو تو ماضی بھی نہیں رہتا اور ماضی نہ ہو تو کچھ بھی نہیں رہتا۔ اس لحاظ سے انسان حال میں زندہ رہ رہا ہوتا ہے لیکن اس کی جڑیں ماضی میں پیوست ہوتی ہیں۔ خالدہ حسین کے ہاں بھی یہ عادات پائی جاتی ہیں کہ وہ ماضی پسندی کا شکار نظر آتی ہیں۔

کاغذی گھاٹ کا ناسٹلجیا ناول کے مرکزی کردار مونا کے بچپن سے شروع ہوتا ہے۔ اس کے بعد تحریک پاکستان، مہاجرین کی آمد، مقامی لوگوں کی ہجرت، دوست احباب کا بچھڑنا، سکول، کالج اور یونی ورسٹی کا زمانہ، تہذیبی و ثقافتی اُتار چڑھاؤ، تاریخی واقعات، طبقاتی تقسیم، زبان کی تبدیلی اور دیگر بہت سے محرکات ایسے ہیں جو ناول میں ایک بھرپور ناسٹلجیائی تحریک کو جنم دینے کا باعث بنے ہیں، جنھوں نے مصنفہ میں بے چینی، اضطراب اور مایوسی کی کیفیات کو جنم دیا۔

شعور و آگہی سے لاعلمی کا دور:

یہ نقطہ نظر Susan Steward نے پیش کیا جس کے مطابق ناسٹلجیا سے دوچار فرد اس دور کے خواب دیکھنا پسند کرتا ہے جب اسے شعور اور علم نہیں تھا۔ انسانی ذہن ہر لمحہ ترقی وارتقاء سے عبارت ہے۔ خالقِ کائنات نے بنی نوع انسان کو پیدائش سے موت تک ایک مسلسل تبدیلی اور سیکھنے کے عمل سے مربوط کیا ہے۔ اب یہ انسان کی صوابدید پر منحصر ہے کہ وہ سیکھنے کے عمل کو مثبت طور پر اپناتا ہے یا خود کو منفی ہتھکنڈوں کے حوالے کر دیتا ہے۔ اس

بحث سے قطع نظر اگر ہم انسانی زندگی کے ارتقائی عمل پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ بات بخوبی سمجھ آتی ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انسانی ذہن شعور و آگہی کی نت نئی منازل طے کرتا چلا جاتا ہے۔ چنانچہ جب اس شعوری ترقی کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہم ناسٹلجیا کو ذہن میں لاتے ہیں تو یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ ناسٹلجیائی یادیں دراصل اس دور سے متعلق ہوتی ہیں جب انسان موجودہ آج سے لازمی طور پر کم باشعور اور خود آگاہ ہوتا ہے۔

عمومی سطح پر دیکھا جائے تو شعور و آگہی کا حصول ایک مثبت قدر ہے تاہم دوسرے زاویے سے دیکھا جائے تو انسان جس قدر باشعور ہوگا اس قدر اس پر ذمہ داریوں کا بوجھ اور توقعات کی فہرست طویل ہوگی۔ چنانچہ یہ دوسرا زاویہ انسان کو زیادہ حساس بنانے کے ساتھ ساتھ زیادہ مشکل میں بھی ڈال دیتا ہے اور وہ چھوٹے چھوٹے واقعات اور تبدیلیوں پر خود کو ذہنی طور پر مقید خیال کرتا ہے۔

ناول کی مرکزی کردار مونا بھی موجودہ دور میں اسی کوفت اور بے چینی سے دوچار ہے، اس لیے اس کا ماضی کی طرف مراجعت کرنا دراصل شعور و آگہی سے لاعلمی کی طرف جانے کا رویہ ہے۔ اس کے لیے بچپن کے وہ تصورات اور خیالات مسحور کن ہیں جن کا حقیقت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا:

> وہ سوچتی ساری نقصان کی باتیں سرحد سے اس طرف ہی کیوں ہوتی ہیں اس کو اپنا ہی دل شور زدہ زمین نظر آنے لگتا جس کی سطح پر شکست اور ازلی خسارے کا زہریلا نمک پھیل رہا تھا۔ پاکستان اتنا کمزور کیوں ہے۔ پھر نحیف و نزار قائد کا سراپا اس کی نظروں میں گھوم جاتا تھا۔[۲]

یہ تمام تصورات و خیالات دراصل ایک بچی کے ذہن کی اختراع ہیں جسے حقیقت حال کا کوئی علم نہیں۔ اس کی تمام ٹوٹی پھوٹی ذہنی تصویریں ان باتوں سے تشکیل پاتی ہیں جو وہ اپنے بڑوں سے سنتی ہے۔ ایسی باتوں کو یاد کر کے ناول کی مرکزی کردار اپنے بچپن کے بھولپن اور سادگی سے محظوظ ہوتی ہے۔ ان تمام تصورات کا منبع اس کے ابا کی بتائی گئی باتیں اور ان کا سیاسی زاویہ نظر ہے۔ سب سے لطف انگیز بات یہ ہے کہ وہ اپنے خیالات اور تصورات کی بُنت میں مکمل طور پر آزاد ہے۔ وہ جیسا چاہے سوچ سکتی ہے اور وہ ان تمام خیالات کے لیے کسی کے آگے جوابدہ نہیں ہے۔

اس کے بچپن میں قائداعظم کی شخصیت کا جو خاکہ تشکیل پا رہا تھا اسے کچھ اس طرح بیان کرتی ہے:

> قائداعظم اور پاکستان دونوں ایک سے ہیں۔ کاش قائداعظم اتنے کمزور نہ ہوتے۔ کاش وہ بہت توانا، بہت مضبوط ہوتے اور وہ ان کی صحت کے لیے کڑھنے لگتی مگر پھر ریڈیو پر ان کی شیر جیسی آواز گونجتی۔ اسے یقین ہو جاتا وہ بہت زور والے ہیں وہ نہیں مریں گے۔[۳]

قائداعظم کی شخصیت کا یہ خاکہ اس کردار کے تصورات کی اختراع ہے۔ اس خاکے کے پس پردہ درحقیقت اس کردار کی قائداعظم کی شخصیت سے گہری محبت اور وابستگی کا بین ثبوت ہے۔ بچپن میں یہ کردار اگرچہ شعور و آگہی کی

بالکل ابتدائی سطح پر جی رہا ہے تاہم اس کے ذہن میں اپنے لیڈر اور اپنی قوم سے محبت کا جذبہ بدرجہ اتم موجود ہے جس کا اظہار اس کے ان خام خیالات اور تصورات کی صورت میں ہوتا ہے۔ اصل حقائق کو جان کر حب الوطنی اور قومی حمیت کے جذبے سے دوچار ہونا ایک فطری امر ہے تاہم لاشعوری طور پر ان جذبات کا اظہار اس کردار کی ذہنی سطح کے اس دور کو ہمارے سامنے لاتا ہے، جب وہ ذہنی طور پر انتہائی ناپختہ ہے۔ اس کے لیے ملکوں کی تقسیم اور شخصیات کا تاثر محض ظاہری آن بان سے مشروط ہے۔ اسی وجہ سے وہ قائداعظم کو ظاہری طور پر مضبوط دیکھنا چاہتی ہے تاہم ان کی آواز کا تاثر اس حد تک گہرا ہے کہ وہ انھیں توانا تصور کر لیتی ہے۔

مونا کے تصور میں جابجا ناسٹلجیائی عناصر کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ کبھی وہ بیتے لمحوں کو یاد کرتی ہے تو اس کا تقابل حال سے کرتی ہے۔ ماضی اُسے حال سے زیادہ بہتر اور پرسکون محسوس ہوتا ہے۔ اس کا جی چاہتا ہے کہ وہ ماضی میں لوٹ جائے کیونکہ وہ اپنے پرانے دور کی اچھائیوں کو یاد کرتی ہے۔ مگر تاریخ کے ان بھیانک واقعات کی شاکی ہے جنھوں نے انسان کو نقصان پہنچایا۔ وہ ایک طرف ناسٹلجیا کا شکار ہے تو دوسری جانب جدید عہد کے منافقوں اور نئی مادیت پسندانہ اقدار کی شاکی ہے۔ اپنے عالمانہ سطح کے ماحول میں اس کی مایوسی اور گہری ہو جاتی ہے۔ جب مونا لاہور شہر کو دیکھتی ہے تو اسے اور کئی دوسرے شہروں کا تصور ذہن میں اُبھر آتا ہے:

> اسے دور دراز کے شہروں کا احساس ہونے لگا۔ کتنے بے شمار شہر ہوں گے اور ان لوگوں کے گھر۔ اس نے دہلی اور لدھیانے کا تصور کرنا چاہا مگر اس نے تو خود لاہور ہی جی بھر کے نہ دیکھا تھا۔ دوسرے شہروں میں تو اس کا تصور کیوں کر بھٹک سکتا ہے۔ دراصل ان کے پورے گھرانے کی جڑیں زمین میں بڑی گہری مضبوط تھیں۔ یوں گویا سب کے سب زمین ہی میں اُگے کھڑے ہوں، قدیم درختوں کی طرح، بڑی اماں اور بڑے ابا بھی لائل پور کی گلیوں کے اگے تھے۔ سب سے پہلے انہی نے زمین کی محبت کا بیج بویا تھا۔ جب کبھی ان سے لاہور منتقل ہو جانے پر اصرار کیا جاتا، یہ ہی جواب ملتا یہاں کی گلیاں نہیں چھوڑ سکتے۔[۴]

شہروں کا تصور جب ایک چھوٹی سی بچی مونا کے ذہن میں ابھرتا ہے تو وہ اپنے آبائی علاقے کو سوچتی ہے جہاں اس کا بچپن شروع ہوتا ہے۔ اپنے بڑے ابا اور بڑی اماں کو یاد کرتی ہے جنھیں اپنی زمین، اپنی مٹی سے بے حد محبت تھی۔ یہ سب اسی مٹی میں اپنی خوشبو کو محسوس کرتے ہیں اور اسی سے اپنا ناتا جوڑے رکھنا ان کی فطرت میں ہے۔

ارضی پیوستگی انسانی فطرت میں شامل ہے۔ اپنے علاقے، زمین، اپنی تہذیب و ثقافت کو چھوڑ کر ایک نئے ماحول سے تعلق جوڑنا ایک مشکل مرحلہ ہے۔ اس مرحلے سے گزرنے کے لیے انسان کو کافی عرصہ درکار ہے۔ مونا بھی ایسی صورت حال کا شکار ہے بلکہ احساس کمتری، بے یقینی، کسک اور کرب میں مبتلا ہے۔ مونا کا واسطہ جب عائشہ اور

افروز سے پڑتا ہے تو وہ احساس کمتری میں مبتلا نظر آتی ہے اُسے ان کے ساتھ وقت گزارنا اور ان کی سوسائٹی میں اٹھنا بیٹھنا عجیب سا لگتا ہے کیونکہ وہ ایک متضاد طبقے کی نمائندگان ہے۔ ان کا ماحول الگ ہے جہاں ہر طرح کی آزادی ہے، کسی قسم کا تعصب نہیں ہے۔ مہذب ہونے کے ساتھ ساتھ عائشہ اور افروز تہذیبی ورثے سے مالامال ہیں جبکہ مونا ایک روایتی گھرانے سے تعلق رکھتی ہے جہاں لگے بندھے اصول اور پرانی روایات ہیں۔ تقسیم ہند کے بعد جب اقدار میں تبدیلیاں ظاہر ہوتی ہیں تو پھر بھی مونا کے گھرانے کی اقدار تبدیل نہیں ہوتیں۔ مونا کی والدہ بھی مذہبی شخصیت ہیں۔ گھر اور باہر کے ماحول میں بہت فرق ہے جس کی وجہ سے کچھ منفی اثرات جو مونا کی شخصیت پر ثبت ہیں وہ یہ ہے کہ وہ باہر کے ماحول سے بیزار نظر آتی ہے اور سہمی سہمی الجھاؤ کا شکار نظر آتی ہے۔ اُسے باہر کی دنیا کی منافقت سمجھ نہیں آتی۔ وہ ایک سیدھی سادھی اور اپنے آپ میں کھوئی رہنے والی لڑکی ہے۔ اُس کی سہیلیاں جب اسے چھیڑتی ہیں، اس سے مذاق کرتی ہیں تو وہ افسردہ اور احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ مونا ایک سادہ لڑکی ہے جبکہ اس کی سہیلیاں بہت چالاک ہیں جیسا کہ اس اقتباس میں مصنفہ نے بیان کیا ہے:

> تمھیں اپنے گھر کا راستہ آتا ہے تیمور لنگ! یہ اس کا نیا لقب تھا۔ بے تحاشا بڑھتے قد کے ساتھ جب کلاس کی لڑکیوں کی قطار بنائی جاتی تو وہ سب سے آخر میں ہوتی اور اپنے بانس جیسے وجود کو چھپانے کی خاطر جھک کر چلنے لگتی۔ دوسروں پر تنقید کرنے میں وہ دونوں بہت ماہر تھیں۔ انھوں نے فوراً اس کا نام تیمور لنگ رکھ دیا۔ ہاں تو افروز نے کہا تھا، تمھیں اپنے گھر کا راستہ آتا ہے تیمور لنگ!
>
> ارے کہاں، اس بی بی کو تو کہار ڈولی لاتے ہیں یہ پردہ نشین ڈولی میں بیٹھے بیٹھے گھر پہنچ جاتی ہے۔[5]

مونا کے کردار کا ایک اور ناسٹلجیائی رُخ جو مصنفہ نے دکھایا ہے وہ یہ ہے کہ وہ ہجوم میں بھی خود کو تنہا محسوس کرتی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اسے چیزیں اپنانے کا ڈھنگ نہیں ہے۔ یہ جب عائشہ اور افروز کے ساتھ ہوتی ہے تو اس وقت بھی خود کو تنہا محسوس کرتی ہے۔ چنانچہ اس کا شعور ابھی تک تعمیری مراحل سے گزر رہا ہے:

> تو ان سب کے جھمگٹے میں وہ اکیلی کہاں تھی مگر نہیں عائشہ اور افروز کے سامنے وہ ایک دم تنہا ہو جاتی کیوں کہ عائشہ کے پاس تو پورا ہندوستان تھا اور اس کے پاس کچھ نہیں۔ شاید جب چیزیں چھن جائیں تو وہ بہت زیادہ اپنی ہو جاتی ہیں۔ اب یہ لاہور کا شاہی قلعہ اور جہانگیر کے مقبرے اور شالیمار باغ یہ سب تو اس کے اپنے تھے، مگر بالکل بھی قابل تذکرہ نہ تھے۔ اسے معلوم تھا کہ جب جی چاہے گا انھیں دیکھ لے گی اور راوی، چپ چاپ ریلوے لائن اور جہانگیر کے مقبرے کے پارے بہہ رہا تھا مگر چیزوں کو اپنانے کا ڈھنگ اسے نہیں آتا تھا اور عائشہ یہاں کی ہر شے ایک ایک کر کے چھین رہی تھی۔[6]

اسی طرح وہ عائشہ سے نور جہاں کے مقبرے کے بارے میں پوچھتی ہے کیونکہ اس کی شخصیت میں بھی اسی

تنہائی اور اداسی دکھتی ہے وہ اپنے معصومانہ ذہن سے اپنی دوست عائشہ کی دلیری کا تصور کرتی ہے کہ کس طرح وہ نور جہاں کے مقبرے تک اکیلی پہنچ گئی۔ یہ تصور غالباً اس کے ذہن میں اس لیے ابھرتا ہے کیونکہ وہ کبھی گھر سے اکیلی باہر نہیں گئی۔ اسے باہر کی دنیا کی خبر ہی نہیں نہ ہی وہ کسی شہر کی گلیوں، سڑکوں اور محلوں سے واقف تھی وہ تو بس گھر میں ہی رہتی تھی یا پھر سکول کالج سے سیدھا گھر واپس آجانا:

> وہ نور جہاں کے مقبرے تک تن تنہا پہنچ کر وہ شعر ہر گز نہ پڑھ سکتی تھی کہ یہ مزار ما غریباں۔ غریب کا مطلب غریب مفلس نہیں، بلکہ مسافر، اجنبی پردیسی ہے۔ وہ سوچتی اتنی بڑی ملکہ نے اپنے آپ کو کس طرح ایک اجنبی مسافر، پردیسی محسوس کیا ہوگا اتنی جاہ و جلال کی زندگی گزارنے کے باوجود یہ مسافری اور تنہائی اور انجانے راستے میں کھوئے جانا تو پھر آدمی کے اندر ہوتا ہے۔[۷]

ناول کی مصنفہ خالدہ حسین کے ناول کے آغاز میں ایک کم عمر اور زیادہ نہ جاننے والی بچی کے حوالے سے مونا کے کردار کو بیان کیا ہے جو کہ ایک سیدھی سادھی لکھاری کالج کی لڑکی ہے۔ یہ ہی وجہ ہے کہ اس بچی کے واقعات اور تصورات غیر واضح، ادھورے اور دھندلے نظر آتے ہیں جو شعور کے تعمیری مراحل سے گزرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ چیزوں اور واقعات میں پراسراریت سی موجود رہتی ہے۔ کسی شے کے ہونے یا نہ ہونے کی تکرار اور خواہش ہے اور ایسے تصورات مبہم ہیں جن کے دائمی ہونے کی خواہش ہے۔

مصنفہ کے ہاں حال کے تہذیبی رویوں سے بغاوت اور ماضی کی اقدار سے محبت پائی جاتی ہے، ماضی کا حسن، سادگی، خالصیت اور ان سے تشکیل پانے والی خوب صورت فضا ہے۔ مصنفہ جدیدیت کی فضا میں سانس تو لیتی ہیں لیکن آہستہ آہستہ اپنے ارد گرد کے سائنسی اور خارجی ماحول سے کنارہ کر کے اپنے داخل میں گم ہو کر تنہائی محسوس کرتی ہیں۔

سیدھے سادے سے مزاج کی مونا مضبوط لوگوں میں خود کو بہت چھوٹا اور کمزور محسوس کرتی ہے۔ جب وہ اپنی سہیلیوں عائشہ اور افروز کے ساتھ ہوتی ہے تو اسے احساس کمتری کا احساس ہوتا ہے۔ کچی املی کی پھلیاں اور کتارا دیکھ کر مونا کا پریشان ہو جانا اور یہ جان کر احساس کمتری میں مبتلا ہونا کہ کچن کی وہ جالی جس کو ہم الماری یا ڈولی کہتے ہیں اسے عائشہ لوگ گنجینہ اور نعمت خانہ کہتے ہیں۔ یہ باتیں یا یہ تصورات ایک ایسی بچی کے ذہن کی اختراع ہیں جو عمر کے ابتدائی سالوں سے گزر رہی ہے جس کے شعور کی پروان آہستہ آہستہ اڑان بھر رہی ہے۔ اسے چھوٹی چھوٹی چیزیں اور واقعات پریشان کر دیتے ہیں جس کے سبب ایک شدید ناسٹلجیائی کرب پیدا ہوتا ہے:

> گھر میں کہیں ان انقلابی نظموں اور سوچ کا سایہ تک نہ تھا وہاں ایک پرسکون، نظم و ضبط والی زندگی تھی۔ گھر گھڑی کی سوئیوں کی طرح چلتا تھا۔ وقت پر جاگنا، وقت پر سونا، نمازیں، تلاوت، رشتہ داروں، احباب کا آنا جانا۔ شام کی چائے پر مہمانوں کی تواضع، کبھی کبھی آبائی منڈلی جمع ہو جاتی اور رات بھر

محفل جمی رہتی۔ مگر یہ سب کے سب سرکاری افسر تھے اور حکومت وقت کے خلاف کچھ کہنا سننا اس گھر کا کلچر نہ تھا۔ بغاوت کے ذائقے سے یہ گھر ناآشنا تھے بس یہاں پر قائد پرستی ہوتی تھی اور اقبال سے محبت کی جاتی تھی اور حفیظ جالندھری اور فیض کا نام سننے میں آتا تھا اور اس شورش بربط نے اتنی بار پڑھی جاتی کہ اسے زبانی یاد آگئی۔

"تم لوگ سرکار کے پٹھو ہو"۔ افروز بڑے آرام سے کہتے۔ "اس لیے تم سچ نہیں بول سکتے۔ تم ڈرپوک ہو۔ بزدل تمہیں ہر کوئی ڈرا سکتا ہے۔ ہاؤ، ہاؤ دیکھا ڈر گئی"۔

"ہاں ڈرپوک ہو۔ ٹوڈی بچہ، ٹوڈی بچہ۔" یہ الفاظ اس نے پہلی بار سنے تھے۔ حسب عادت وہ پلٹ کر ان کا مطلب پوچھ سکی، مگر جو کچھ بھی تھا، بہت برا۔ بہت رسوا کن۔ بڑا باعث شرم۔ وہ کھڑے کھڑے زمین میں گڑ جاتی۔[8]

مونا کو جب اس کی سہیلی افروز ٹوڈی بچہ کہہ کر مخاطب کرتی ہے تو وہ بہت برا محسوس کرتی ہے اور شرم سے پانی پانی ہو جاتی ہے۔ اس کا جی چاہتا ہے کہ وہ کھڑے کھڑے زمین میں دھنس جائے اس کے لیے یہ الفاظ باعث شرمندگی تھے۔

مونا بے تحاشا بڑھتے ہوئے قد اور بڑھتے ہوئے جوتوں کے ساتھ خود کو دیکھ کر بدحواس ہو جاتی جب اس کی سہیلیاں اس کے سامنے کھڑی ہوتی ہیں اور جب کہ مونا جو ان کے ساتھ احساس برتری کے احساس سے سرشار ہے اور دوسری جانب عائشہ اپنے انقلابی خیالات کا انبار لیے ہوئے ہے مونا کو ہمیشہ ہی عائشہ اور افروز کے سامنے احساس کمتری کا مرض لاحق رہتا ہے جس کے باعث وہ ہر لمحہ اذیت اور پریشانی کا شکار نظر آتی ہے۔ مونا اور عائشہ کے ہر ہر عمل اور پہلو سے برتری کا احساس نظر آتا ہے اور وہ اپنے آپ کو کوسنے لگتی ہے۔

مونا کو قائداعظم سے بے حد محبت اور گہرا لگاؤ ہے۔ وہ جب قائداعظم کی وفات کا سوچتی ہے تو اداسی اس کے اندر سے ٹپکنے لگتی ہے۔ چھوٹے سے ذہن کی بچی اپنے قائد کے مر جانے کے غم سے نڈھال ہو جاتی ہے۔ موت کی خاموش دہشت اس کے دل میں بیٹھتی جا رہی تھی۔

پھر ایک وقت جب چودہ اگست آتا ہے عائشہ کے تنقیدی جملے اُسے پھر سے سننے کو ملتے ہیں:

پھر تم نے چودہ اگست کو کتنے دیے جلائے اپنی منڈیر پر؟ عائشہ یوں پوچھتی جیسے یہ سب کچھ کرنا انتہائی جہالت کی دلیل ہو۔ اسے پھر شدت سے اپنی بزدلی کا احساس ہونے لگتا۔[9]

مونا ہر وقت عائشہ سے خوفزدہ اور سہمی رہتی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مونا عائشہ کے تنقیدی جملوں سے کتراتی تھی اور اس کی مفرور طبیعت سے بھی اُسے بیر تھا۔ عائشہ کے انگریزی بولنے اور نئے نئے لفظ استعمال کرنے پر وہ جلن

کے مارے آگ بگولہ ہو جاتی۔

ناول کے باب نمبر چار میں کرداروں کی ذہنی سطح پہلے سے بلند ہو چکی ہے اور ان میں شعور و آگہی کی نئی راہیں ہموار ہو رہی ہیں۔ سب سے زیادہ تبدیلی عائشہ میں آئی جب وہ میٹرک کلاس میں تھی۔ گرمیوں کی چھٹیاں گزار کر آنے کے بعد اس میں ایک خاص رکھ رکھاؤ اور نفاست آگئی تھی۔ انگریزی کے بہت سے ناول پڑھ چکی تھی اور انگریزی گرائمر پر اسے بلا کا عبور حاصل ہو چکا تھا اور بہت سے محاورے، الفاظ اور جملے روز مرہ گفتگو میں شامل ہو چکے تھے اور بہت سے نئے نئے لوگوں کا تذکرہ اس کی زبان پر رہنے لگا۔ بہت کار آمد اور مفید قسم کے کلشے اور سلوگن اس کی بول چال میں شامل تھے۔ وہ کسی نئی دنیائی سرحد کو پار کر چکی تھی جیسے ذہن کسی نئی آگہی سے آشنا ہو جائے اور یہ ایک نیا دور تھا کہ جس کا در اس پر وا ہو گیا تھا۔

ناول میں باب نمبر چار لاہور کی بدلتی ہوئی ثقافت کا منفرد بیان ہے۔ اس حوالے سے منشا یاد اپنی کتاب خالدہ حسین کا فن میں تحریر کرتے ہیں:

> اس ناول میں لاہور کی بدلتی ہوئی جاگیر دارانہ ثقافت کا نقشہ بہت عمدگی سے کھینچا گیا ہے۔ یہ یہاں کے قدیم لوگ تھے۔ ہر حکومت میں شامل رہتے تھے۔ بیٹوں کو ولایت یا چیفس کالج اور گلیات میں اور بیٹیوں کو انگریزی اداروں میں تعلیم دلاتے، ان کی رگ رگ میں تحکم اور دولت پرستی بھر دی جاتی۔ یہ لوگ سروس سول میں آکر بڑے بڑے خاندانوں کی خوب صورت لڑکیوں کی تلاش میں رہتے۔ فوج اور فضائیہ کے جوانوں کی کالج کی لڑکیوں میں مقبولیت، گریجوایشن کرتے کرتے وہ کپتانوں، لیفٹیننٹوں کی بیگمات بن جاتیں۔ مگر مونا کے پرانی وضع کے گھر میں ابھی تک سمجھا جاتا تھا کہ پڑھائی میں نالائق ہی فوج میں بھرتی ہوتے ہیں۔ نئی نئی مڈل کلاس کا کیا عالم تھا اور وہ کسی اپر کلاس میں شامل ہونے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی تھی۔ [۱۰]

مونا جب گزرے لمحات کو یاد کرتی ہے تو اسے اپنے بچپن کی باتیں یاد آتی ہیں جب اسے کم شعور تھا، وہ بہت کم جاننے والی معصوم ذہن کی مالکہ تھی۔ جب اردو زبان بولنے کا رواج چل نکلا تھا اور پنجابی زبان بولنے والے بھی اردو کو ترجیح دینے لگے تو اس بچے کے ذہن میں طرح طرح کے سوالات پیدا ہوئے کہ عربی زبان میں نماز ادا کرنے کے بعد کی زبان تو ہمیشہ پنجابی ہی ہوتی ہے۔ دعا، نماز سے کہیں زیادہ طویل و عریض ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ وہ صرف پنجابی میں ہی گفتگو کر سکتی تھی کیونکہ وہ تو اس کی شہ رگ سے قریب تھا اور اس شہ رگ میں رواں دواں لہو تو صرف پنجابی ہی جانتا اور سمجھتا تھا۔ یہ سب ایک بچی کے ذہن میں الجھا دیا گیا تھا لیکن اُسے ابھی تک یہ شعور نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ کو کسی زبان کے سمجھنے کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ وہ ذات تو گونگوں کی زبان بھی سمجھ سکتی ہے۔ وہ ذات بندے کی شہ رگ

سے بھی زیادہ قریب ہے:

> عربی میں نماز ادا کرنے کے بعد کی زبان تو ہمیشہ پنجابی ہی ہوتی۔ دعا، نماز سے کہیں زیادہ طویل و عریض ہوتی اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ وہ صرف پنجابی ہی میں گفتگو کر سکتی تھی کیونکہ وہ تو اس کی شہ رگ سے قریب تھا اور اس شہ رگ میں رواں دواں لہو تو صرف پنجابی ہی جانتا اور سمجھتا تھا۔ لفظوں نے اسے الجھانا شروع کر دیا۔[11]

اسی طرح مونا کے شعور کی ناپختگی اور کم جاننے والی لڑکی کی حیثیت کی مثال کچھ اس طرح ناول میں دیکھی جا سکتی ہے:

> مائی بھولی نماز کے لیے کھڑی ہو گئی۔ وہ سیڑھی پر اسے دیکھتی رہی۔ اسے نماز کے دوران لوگوں کو دیکھنے کا بہت ہوکا تھا۔ لوگ کس طرح اللہ میاں کے قریب جاتے ہیں۔ وہ سوچتی رہتی۔ مائی بھولی اونچی آواز میں نماز پڑھتی تھی۔ اس وقت وہ اس کی نماز سن کر سکتے میں آ گئی۔ معلوم نہیں وہ کون سی زبان، کیا الفاظ تھے۔ کہیں کہیں عربی کا کوئی لفظ پنجابی کے ساتھ ملا جلا اس کی سمجھ میں آ جاتا ورنہ کمال روانی سے پڑھی جانے والی نماز سراسیکی اور اصل نماز کے ٹوٹے پھوٹے ریزوں کا ملغوبہ تھی۔ اس نے اب تک ابا کی خشوع و خضوع اور وقت سے لبریز نماز سنی تھی اور مولانا داؤد غزنوی کی عیدین کی نماز جس میں ان کی آواز میں گداز ہوتی اور الفاظ پگھل پگھل کر آنسو بنتے جاتے تھے۔ اس کے مقابلے میں یہ نماز، یہ عجیب و غریب کھردرے، ٹوٹے پھوٹے الفاظ کا مجموعہ جن کا کوئی مفہوم نہ بنتا تھا۔ یہ کیا تھا۔ وہ لرز اُٹھی۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ کیا اللہ میاں اس زبان کو سمجھتا ہے۔ پھر اس نے مائی بھولی کے پرسکون چہرے کی طرف دیکھا جسے یقین تھا کہ اللہ اور اس کے درمیان مکالمہ جاری ہے۔ ایک گہری اداسی سے اس کا دل دہلنے لگا۔[12]

شعور و آگہی سے لاعلمی یہ نقطۂ نظر Susan Steward کا پیش کردہ ہے جس کے مطابق ناسٹلجیا سے دو چار فرد اس دور کے خواب دیکھنا پسند کرتا ہے جب اسے شعور اور علم نہیں تھا۔ انسانی ذہن شعور و آگہی کی نت نئی منازل طے کرتا ہے جسے درجہ بدرجہ ترقی کی منازل طے کرنا پڑھتی ہیں۔ چنانچہ جب اس شعوری ترقی کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہم ناسٹلجیا کو ذہن میں لاتے ہیں تو یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ ناسٹلجیائی یادیں دراصل اس دور سے متعلق ہوتی ہیں جب انسان موجودہ آج سے لازمی طور پر کم باشعور اور خود آگاہ ہوتا ہے۔

ناول کی کردار مونا بھی موجودہ حقیقت حال سے کم باخبر ہے وہ اپنے ذہنی زاویے سے سوچتی ہے اور اُسے ہی حقیقت تصور کر لیتی ہے مگر حقیقت ہمیشہ اس کے برعکس جا رہی ہوتی ہے:

وہ تو ہر پیارے کی موت کے لیے خوفزدہ رہتی تھی۔ مگر پھر بڑی بڑی دلیلیں لا کر نچنت ہو جاتی کہ یہ لوگ مر نہیں سکتے کیونکہ ان کے مرنے کی کوئی منطق ہی نہیں بنتی تھی۔ مگر قائداعظم تو ہر منطق کے خلاف ہر دلیل کو رد کرتے ہوئے مر گئے۔ ان کی موت سے ایک دن پہلے بڑے بھیا کے کمرے میں لگی ان کی تصویر، فریم کے اندر خود بخود ٹیڑھی ہو گئی۔ [۱۳]

غیر شعوری طور پر کسی شخصیت کے حصار میں اس حد تک مدغم ہونا بچپن کی یادوں کا بہت حسین باب ہوتا ہے۔ ناول میں واحد متکلم بھی اسی قسم کی یادوں میں گم ہے۔ موت کا ایک غیر مرئی تصور اس کے ذہن میں ایک انجانے خوف کو جنم دیتا ہے۔ وہ موت کے لیے کسی منطق کو ضروری سمجھتی ہے۔ اس لیے اپنے پیاروں کی موت کا کوئی جواز اسے نظر نہیں آتا۔ چنانچہ وہ موت کے تصور سے خود کو اور اپنے پیاروں کو بچا لینے کی متمنی ہے۔

پروسٹن ناسٹلجیا:

پروسٹن ناسٹلجیا سے مراد کوئی اچانک پیش آنے والا واقعہ یا ایسا سانحہ ہے جو ماضی کے کسی خاص جذباتی تجربے کو سلسلہ وار طریقے سے سامنے لاتا ہے۔ اس سلسلے میں واقعات اچانک نمودار ہوتے ہیں اور فوری طور پر غائب بھی ہو جاتے ہیں۔

کاغذی گھاٹ میں ناسٹلجیا کی ایسی کیفیت کو بخوبی دیکھا اور محسوس کیا جا سکتا ہے۔ واقعات کی ایک ایسی سلسلہ وار رو چلتی دکھائی دیتی ہے کہ پھر ایک واقعہ کے بعد اگلا واقعہ اس کی کڑی بنتا جاتا ہے اور واقعات کا ایک طویل سلسلہ چل پڑتا ہے۔ اچانک سے یہ واقعات آتے جاتے ہیں اور نمودار ہونے کے بعد ختم ہوتے چلے جاتے ہیں جیسے مندرجہ ذیل اقتباس سے اس کیفیت کی نشان دہی کی جا سکتی ہے:

اس کے ساتھ تو بس یہی کچھ ہونے لگا تھا۔ بیٹھے بیٹھے سب کچھ بدل جاتا۔ وقت کا تسلسل چھوٹے چھوٹے ان گنت ٹکڑوں میں بکھر جاتا۔ مکالمہ، عمل اور صوتی اثرات الگ الگ ہو جاتے اور مفہوم کہیں ہواؤں میں تاریک پرندوں کی طرح نیچے اوپر تیرتا رہتا۔ ان ہی دنوں اس نے سکول میں ڈرامائی مقابلے کے لیے ایک چھوٹا سا ڈرامہ لکھا جس کے دوران لکھتے لکھتے اسے اپنا قلم، کاغذ اور ہاتھ اجنبی نظر آنے لگے۔ اسے یہ جان کر سخت پریشانی ہوئی کہ زندگی میں کچھ بھی، الفاظ، حرکت اور آواز کے بغیر وقوع پذیر نہیں ہو سکتا۔ اسے اپنا تمام جسم سن ہوتا محسوس ہوتا۔ اپنے آس پاس چلتے ہوئے لوگ اسے مکالمے بولتے محسوس ہوتے۔ جو کچھ بھی تھا، حالات ہرگز معمول پر نہ تھے۔ وہ دوسروں جیسی نہ تھی۔ وہ دوسروں سے الگ تھلگ مختلف تھی اور بالکل تنہا۔ [۱۴]

کاغذی گھاٹ میں واقعات کا تنوع اور طوالت پائی جاتی ہے۔ جب خالدہ حسین واقعات کے بیان میں

شعور کی رو کی تکنیک استعمال کرتی ہیں تو واقعات کا ایک انبار ان کے ذہن کے کینوس پر ابھرتا چلا جاتا ہے اور پھر ان میں سے ایک واقعہ نمایاں ہو کر انھیں حال سے مستقبل یا ماضی میں، ماضی سے حال یا مستقبل میں، یا مستقبل سے حال یا ماضی میں لے چلتا ہے۔ اس طرح شعور کے بہاؤ کسی بھی قسم کے منطقی ربط کا لحاظ کیے بغیر کہانی کو آگے بڑھاتا چلا جاتا ہے:

> وہ کلاس میں بیٹھے بیٹھے جنگلوں، پہاڑوں میں گم جاتی اور جگہ جگہ اسے وہ بڑے بڑے راون نظر آتے جو لائل پور میں دسہرے کے موقع پر بیچ چوراہوں کے کھڑے کیے جاتے تھے اور پھر ان کو آگ لگائی جاتی تھی اور بہت سے سروں اور لمبے لمبے دانتوں والے راون شعلوں میں جلتے بھنتے خاک ہو جاتے جن کی لپک آسمان تک تھی۔ مگر پھر تھوی راج اور سنجوگتا آ جاتی جس نے بھری سوئمبر میں ہار پر تھوی راج کے گلے میں ڈال دیا اور پھر اس کے برق رفتار گھوڑے پر گرد ہو گئی اور بڑے بڑے راج کمار اور بلوان دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔[۱۵]

> یہاں کے سب لوگ کہاں ہو گئے؟؟ اس نے ایک کمرے میں ٹھہر کے سوچا۔ غسل خانے میں کنڈی کے ساتھ سرخ چوڑیاں لٹک رہی تھیں۔ وہ ٹھٹک گئی۔ اس نے غور سے اندر جھانکا جیسے ابھی کوئی گوری چٹی، مسز نندہ جیسے گول مٹول عورت گیلے بدن اور بوندیں ٹپکاتے بالوں کے ساتھ ٹب میں سے باہر نکلے گی اور کنڈی کی طرف ہاتھ بڑھائے گی۔ اس کے بدن کی تفصیلات پر اس کا ذہن گڈ مڈ ہوتا چلا گیا۔ پھر امی اور منجھلے بھیا بھی اِدھر آن نکلے۔[۱۶]

واقعات کا تسلسل اپنی پوری جد وجہد کے ساتھ قافلے میں رواں دواں ہے۔ ایک واقعہ ابھی ختم ہوتا نہیں ہے کہ اگلا واقعہ نمودار ہو جاتا ہے۔ واقعات کا یہ تسلسل مصنفہ کے لاشعور میں یادوں کی برآت کا سمندر بن کر امنڈتا چلا جاتا ہے۔ ناول کی واحد متکلم کو اپنے خاندان کی خوب صورت یادیں ستانے لگتی ہیں جب وہ اُن کا ذکر چھیڑتی ہے تو سلسلہ وار قصے شروع ہو جاتے ہی جو بغیر کسی ربط کے آتے اور چلے جاتے ہیں۔ مثلاً:

> کتنا بڑا خاندان تھا ان کا۔ سب ماموؤں اور خالاؤں کے کنبے ملا لیں تو چالیس پچاس لوگ تو ایسے ہی بن جائیں اور یہ سب گنتی کے افراد نہ تھے۔ ایک دوسرے کی زندگی میں حلول کر جانے والے تھے۔ آتے جاتے ملتے ملاتے، کوئی شام ایسی نہ تھی جب پانچ چھ لوگ ان کے گھر نہ آتے۔ وہ خود تو دوسروں کے ہاں کم ہی جاتے تھے۔ شاید اس لیے کہ ابا خاندان میں سب سے بڑے تھے۔ یہ گھر ایک طرح کا مرکز تھا۔ سائبان، جس میں ہر کوئی اپنا حق جان کر آن ٹھہرتا۔ ہمیشہ کوئی نہ کوئی عزیز ان کے گھر میں مستقل قیام رکھتا۔ کبھی کوئی تبادلہ کی صورت میں کہ جب تک مکان کا بندوبست نہ ہو جائے یا پھر کوئی امتحان دینے کے لیے، کوئی خاندان جھگڑے کی متاثر لڑکی، کوئی سیر کار سیا یا پھر کوئی کاروبار میں پھنسا یا کوئی لمبا

مریض علاج کی غرض سے، دور دراز کے لوگ بھی اس گھر میں آکر اس طرح بستے کہ خاندان کا فرد ہو جاتے۔ گھر سے ملحقہ باورچی خانہ میں خانساماں ہر وقت مصروف نظر آتا۔ اماں بھی اکثر وہیں ہوتیں یا پھر کچن کے ساتھ والے برآمدے میں موسمی سبزیوں کے اچار، چٹنیوں میں مصروف۔ قریب ہی آس پاس کے کواٹروں کے بچے سپارے کا سبق پڑھتے۔ رشید ڈرائیور کی بیٹی شادو نے پورا قرآن اماں سے پڑھا تھا۔ وہ کورے رنگ بھوری آنکھوں والی خوب صورت لڑکی تھی۔ جب سبق سے فارغ ہوتی وہ اکثر کپڑے کاڑ کھیلا کرتی۔ قرآن شریف ختم کرنے پر اس کی ماں مٹھائی لے کر آئی تھی۔ وہ اکثر سرسوں کا ساگ بھی پکا کر لاتی جو ان کے گھر میں ایک ڈیلی کیسی کے طور پر کھایا جاتا۔ لہسن اور ادرک کی خوشبو اور دیسی گھی میں ڈوبا ساگ، جس پر ثابت سرخ مرچوں کا بھگار تیرتا۔[17]

مخدوم صاحب کے گھر سے آنے والا پستہ۔ تب لوگ کتنے سیدھے اور پیار کرنے والے تھے۔ وہ سب بڑے بھیا سمیت مخدوم صاحب کی ٹھیٹھ سرگودھوی پنجابی سننے کے لیے ان کے گرد جمع ہو جاتے۔ وہ اپنا حقہ ساتھ لے کر آتے جسے نہایت خشو و خضوع کے ساتھ لان میں لگے نل سے تازہ کرتے۔ اس کے نیچے میں پانی بھرتے۔ پھر سرخ برآمدے میں آن بیٹھتے۔ ان کا ڈرائیور گاڑی کی ڈگی میں سے خاص تمباکو کی بل کھاتی گہری بھورے رنگ کی لڑیاں نکالتا۔ پھر کچن میں سے چلم میں آگ آتی جس پر تمباکو اور گڑ والی ڈلی رکھی ہوتی۔ حقے کے ہر کش پر وہ سرور سے آنکھیں بند کرتی، ان کا یہ جملہ ان کو بہت لطف دیتا۔

"وت پاؤوت گڑ گڑ کریندا" وہ سب بمشکل ہنسی روکتے۔ پیٹ دبائے بھاگ نکلتے اور اندر لان میں پہنچ کر فرش پر لوٹ جاتے۔ وت پاؤوت گڑ گڑ کریندا ایک رٹ لگا لگا کر باؤلے سے ہو جاتے۔ مگر اس میٹھی بولی کی کشش انھیں گھنٹوں مخدوم صاحب کے پاس بٹھائے رکھتی۔[18]

ناول میں ایسے واقعات بہت زیادہ ہیں جو ارد گرد کی بکھری ہوئی کہانیاں ہیں مگر ان کی کڑی آپس میں ملتی جلتی ہے۔ کچھ واقعات ایسے ہیں جو تہذیب و ثقافت کی بحث سے متعلق ہیں۔ اس میں ہجرت کے نتیجے میں ہونے والے انتقالِ آبادی اور اس کے ثقافتی اثرات کو نمایاں کیا گیا ہے۔ نوزائیدہ ریاست کے معاملات، ثقافتوں کے افتراق اور طبقاتی تقسیم سے متعلق سوالات و جوابات کا سلسلہ ناول کی واحد متکلم کو کش مکش میں مبتلا کرتا ہے۔

مونا ایک روایتی گھرانے کی حساس لڑکی ہے۔ شاید ڈرپوک بھی ہے اور رجعت پسند بھی جب کہ اس کی سہیلیاں عائشہ اور افروز ماڈرن سوسائٹی سے تعلق رکھنے کے ساتھ مختلف تہذیبوں کی نمائندہ ہیں۔ اس لیے ان کے لائف اسٹائل میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اس کے نتیجے میں مونا کی زندگی پر ان کے گہرے اثرات مرتب ہیں۔ طبقاتی افتراق کے نقوش مونا کی زندگی پر بہت گہرے ثبت ہیں۔ زندگی سے متعلق مونا کے تجربات میں پختگی پیدا کرنے

والے بھی یہ ہی کردار ہیں اور احساسِ کمتری کے ساتھ، بے یقینی اور کسک میں بھی یہ ہی مبتلا کرتے ہیں۔

ناول کے شروع میں مصنفہ نے بہت سی باتیں ایک کم عمر اور زیادہ نہ جاننے والی بچی کے حوالے سے اور بعد میں ایک سیدھی سادھی لکھاری کالج کی لڑکی کے حوالے سے بیان کی ہیں۔ اس تکنیک سے دو طرح کی خوبیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ ایک یہ کہ چیزوں اور واقعات میں ایک پُراسراریت سی موجود رہتی ہے۔ دھندلی غیر واقع اور ادھوری بیان ہونے والی چیزیں اور تصویریں جن میں ایک رومانی تشنگی موجود ہوتی ہے۔ دوسری یہ کہ لکھنے والا تفصیل نگاری سے بچ جاتا ہے اور حیرت کا اظہار کرنے اور سوالات اٹھانے والے کردار ہی نہیں بیان کرنے والی مصنفہ کی معصومیت بھی برقرار رہتی ہے۔

کم جاننے اور حیرتوں میں ڈوبے ہوئی مونا کے روپ میں جس کے نقطہ نظر سے کہانی چلتی ہے سوال پر سوال، تلخ و ترش اور چبھتے ہوئے، کبھی کبھی زہر میں ڈوبے ہوئے سوال کرنے والا معصومیت سے آگ لگا کر چلا جاتا ہے۔ سننے والا کتنی کتنی دیر تڑپتا سلگتا رہتا ہے۔ بعض سوالات زندگی بھر اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ مثلاً

> بت شکن محمود غزنوی کا اپنے ملک کے بت چھوڑ کر سومنات کے بت کو توڑنا اور سونا اور ہیرے جواہرات بوریوں میں سمیٹ سمیٹ واپس گھر کو سدھارنا۔ یہ سوال حیرتوں میں ڈوبی مونا کے ذہن کی اختراع ہے۔ یہ اس کی کم مائیگی اور ناپختگی کے باعث سوالات جنم لیتے ہیں۔
>
> محمود غزنوی نے ہندوستان پر سترہ حملے کیے۔ وہ حیران رہ جاتی، بہت کوشش پر بھی برق رفتار گھوڑوں پر سوار محمود غزنوی کی کوئی صورت اس کے ذہن میں نہ آتی مگر سومنات کے اس بُت کا ہیولیٰ ضرور آجاتا جو مندر کا سب سے بڑا بت تھا اور جس کی آنکھیں دو قیمتی ہیروں کی تھیں اور جسے توڑتے ہوئے محمود غزنوی نے کہا تھا کہ میں بُت شکن ہوں بُت گر نہیں۔[19]

ایک اور ایسا سوال جو معصوم ذہنی سطح کی حامل مونا کو سوچ میں مبتلا کر دیتا ہے، جب اس سے راجپوت ہونے کے متعلق سوال کیا جاتا ہے کہ وہ کہیں راجپوت تو نہیں، ایسے میں بوکھلا سی جاتی ہے کہ راجپوت تو سب کے سب چلے نہیں گئے یہاں کہاں سے راجپوت آئے:

> کہیں آپ راجپوت تو نہیں؟ چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے اس نے اچانک پوچھا۔
>
> "راجپوت" وہ بوکھلا گئی۔ تو کیا وہ سب کے سب چلے نہیں گئے۔ راجپوتوں کا یہاں کیا کام۔ وہ تو علاؤالدین خلجی سے لڑے تھے اور رانی بدمنی نے جوہر کی رسم ادا کی تھی۔ وہ سب کے سب آن پر کٹنے والے۔[20]

جستجو اور تجسس کا مادہ انسانی فطرت کا حصہ ہے۔ انسان جوں جوں عمر کی سیڑھیاں طے کرتا چلا جاتا ہے اس کی

شخصیت میں تجسس اور آگہی کا مادہ بڑھتا چلا جاتا ہے اور وہ مزید جان لینے کی جستجو میں لگ جاتا ہے۔ تاہم اشیا اور ان کی حقیقت کو جان لینا بعض اوقات تکلیف دہ بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کا حال جتنا بھی ترقی یافتہ اور مہذب ہو وہ اپنے گزرے ہوئے کل میں زیادہ دل چسپی محسوس کرتا ہے۔ اس دل چسپی کا اصل محرک لاعلمی یا کم علمی ہے۔ ماضی ہمیشہ وہ دور ہوتا ہے جب انسان کم آگاہ اور کم فہم ہوتا ہے۔ ناول کی کردار مونا کے لیے ذاتوں اور سماجی طبقات کو جان لینا تکلیف کا باعث بن رہا ہے۔ وہ ان تمام حد بندیوں اور طبقاتی تفاوت سے بالاتر ہو کر سوچنا چاہتی ہے لیکن سماج اسے یہ سب ذاتیں، برادریاں سکھانے پر بضد ہے۔ ایسے میں حال کے اندر جیتے ہوئے ان تکلیف دہ حقائق کو جاننا اسے بہت تلخ محسوس ہو رہا ہے۔ چنانچہ وہ ماضی کی طرف ذہنی مراجعت پر مجبور ہوتی ہے جب وہ ان تمام طبقاتی سوچوں سے بے بہرہ تھی:

> اسے معلوم تھا ایک نہایت اذیت ناک مرحلہ اس کی زندگی میں آنے والا ہے۔ جب خاندانی، بسر سر روزگار لڑکوں کی مائیں اسے بھیڑ بکری کی طرح جانچیں گی اور ٹٹولیں گی اور ناک منہ چڑھائے چلی جائیں گی اور اسے اس سے خود نہ فرق پڑے گا مگر اماں، اماں۔ ان کا گھلتا جسم اور چہرے پر تشویش کی پرچھائیاں اور آنکھوں کی اتھاہ اداسی، زندگی کس طرح غیر ضروری طور پر تکلف بنا دی جاتی ہے۔ افروز سچ ہی تو کہتی ہے۔ یہ صدیوں کا جابرانہ سوشل نظام جو ہمارے رگ وپے میں سرایت کر چکا ہے۔ چاہیں بھی تو اس میں سے بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتے۔[۲۱]

صدیوں کے بنائے جابرانہ سوشل نظام کے آگے مونا اپنے آپ کو بے بس سمجھتی ہے وہ یہ سوچنے پر مجبور ہے کہ آخر یہ نظام کیوں بنایا گیا ہے اور ہم اس نظام سے اپنے آپ کو باہر کیوں نہیں نکال سکتے۔ کم جاننے اور حیرتوں میں ڈوبی مونا کو اس بات کی تشویش لاحق ہے کہ اس کی اماں کے گھلتے وجود کو اگر کچھ ہو گیا تو وہ کیا کرے گی۔ اسے اپنی تو کوئی فکر نہ تھی مگر وہ اپنی ماں کی اداسی اور پریشانی کا کیسے مداوا کرے۔ جو نظام اس معاشرے کی رگ وپے میں سرایت کر چکا ہے وہ اس سے خود کو کیسے آزاد کرے۔ اسے اپنی دوست افروز کی کہی ہوئی باتیں یاد آتی ہیں کہ وہ ٹھیک کہتی ہے کہ وہ اس نظام کے خلاف بغاوت کا شعور رکھتی ہے۔ اس کے ساتھ اُسے یہ خیال بھی سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنی بزدلی کی وجہ سے کچھ کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتی:

> اوہ بھئی، اسلام میں تو یہ سب کچھ ہے ہی نہیں۔ یہ سب ہندو تہذیب کے اثرات ہیں۔ یہ کیا کہتے ہیں لڑکیاں پسند کرنا اور جہیز دینا اور لڑکی رخصت کرتے ہوئے باپ کا لڑکے کے باپ کے قدموں میں اپنی پگڑی رکھ دینا اور ہاتھ جوڑنا اور کہنا۔ میری عزت اب آپ کے ہاتھ میں ہے۔ لاحول ولا.....
> بڑے ماموں حقہ گڑگڑاتے بولے۔ انھوں نے اپنی بیٹی کی شادی پر بھی یہ ہی کچھ کیا تھا اور وہ لوگ اب تک ان کی پگڑی کو فٹ بال بنائے ہوئے تھے۔

یہ لڑکے والے کیا ہوتے ہیں، کیا ساتویں آسمان سے اتر کے آتے ہیں، ماموں جان۔

اس نے پوچھا۔ [۲۲]

ایسے سوالات مونا کو حیرت زدہ کر دیتے ہیں اور وہ اپنے اس ذہنی اختراع کی گتھیاں سلجھانے میں محو رہتی ہے کہ آخر یہ نظام کیوں بنایا گیا ہے۔ بیٹی کے والدین کیوں اس قدر مجبور ہو جاتے ہیں کہ اپنی آن بان شان کسی کے حوالے کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں جب کہ لڑکے کے والدین کو اس بات کی کوئی پروا نہیں ہوتی۔ وہ بڑے دھڑلے کے ساتھ بیٹیوں کے والدین کو جیسے چاہیں سلوک کریں:

> حدود، حدود..... مائی فٹ، یہ حدود کیا ہوتی ہیں؟ دنیا مر رہی ہے، بجلیاں ہیں، قحط ہے، آرام ہے۔ کیسی کیسی دختران مادر ایام ہیں۔ یہ تمھارے بہت مومن شاعر اقبال نے کہا ہے تو دنیا مر رہی ہے۔ غربت، جہالت، بیماری استحصال اور تم لوگ حدود گن رہے ہو۔ آگے بڑھ کر معاشرے کو نہیں بدلتے، جس میں نوے فیصد لوگ ڈھور ڈنگر کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ مذہب تمھیں یہی سکھاتا ہے۔ کچھ ورچو ئلز حالانکہ اس مذہب میں جس قدر کمیونٹی انسانی برادری کی دلداری ہے کہیں نہیں۔ یہ تو آیا ہی ظلم اور جبر سے رہائی دلانے کے لیے تھا۔ احترام آدمیت سکھانے کے لیے۔ خدا کے لیے ہل ہل کر قرآن پڑھنا بند کرو۔ مفہوم سمجھو مفہوم۔ یہ سفاک ترین حملہ تھا افروز کا۔ وہ سر سے پاؤں تک کانپ گئی۔ [۲۳]

مونا ایک روایتی گھرانے کی لڑکی ہے، روایتوں کے کھونٹے سے بندھی ہوئی۔ لگے بندھے اصولوں کے تحت زندگی گزارتی ہے جبکہ اس کی سہیلی افروز ایک انقلابی خیالات کی حامل لڑکی ہے۔ دونوں کے متضاد رویے ایک دوسرے کو کھٹکتے ہیں۔ جب افروز مونا کو سماجی اور سیاسی صورت حال سے آگاہ کرتے ہوئے تنقید کا نشانہ بناتی ہے تو وہ سر سے پاؤں تک کانپ اُٹھتی ہے ایسے سفاک ترین جملے جو افروز اسے سناتی ہے وہ مونا کو بے چین کر دیتے ہیں۔

ناول میں سماجی و سیاسی ابتری کو ناسٹلجیائی پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ ایک طرف تہذیبی، اخلاقی اور معاشی تحرک بنیادی سروکاروں میں سے ہیں، تو دوسری طرف فرد کا اپنا وجود نفسیاتی اور نفسی دباؤ، فکری ارتعاشیات، تخلیقی عمل کی صورتیں، وقت اور زماں سے جڑے ہوئے تصورات ناول کا حصہ بنتے ہیں۔ ہمارا سیاسی نظام بد قسمتی سے ابتدا ہی سے اپنے قدموں پر کھڑا نہ ہو سکا اور سیاسی عمل کی بے ہنگم رفتار کی وجہ سے اقتدار مارشل لاؤں کے سپرد زیادہ رہا ہے۔ اور پاکستانی اردو ادب بالخصوص فکشن میں پاکستان میں رونما ہونے والی ان بتدریج تبدیلیوں اور ان کے پس منظر کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی تاہم خالدہ حسین کا ناول کاغذی گھاٹ بھی ملک کی سماجی، سیاسی، اقتصادی اور ثقافتی زندگی کا پیش خیمہ ہے جس میں تحریک پاکستان کے بعد کی سیاسی و سماجی افراتفری اور سیاسی شعور سے لبریز ناول میں مارشل لاء

دور کی ساری منافقتیں، استحصال اور جمہوری اقدار کی پامالی کا نوحہ موجود ہے۔

ناول کا کینوس بظاہر بہت چھوٹا ہے مگر اس کا فکری کینوس بہت بڑا ہے جو حیرتوں میں ڈوبی مونا کے ذہن میں طرح طرح کے سوالات جنم دینے کا باعث بنتا ہے۔ محمود غزنوی نے بت پرست کہلوانے کے بجائے بت شکن کہلوانا پسند کیا۔ علاؤالدین خلجی نے ایک حسینہ کو پانے کے لیے چتور پر حملہ کیا، حالانکہ حسن تو ہر جگہ مل جاتا ہے۔ آخر یہ کیا راز ہے، جنگیں کیوں ہوتی ہیں؟ ۱۹۶۵ اور ۱۹۷۱ کی پاک بھارت جنگوں کا کیا نتیجہ نکلا؟ انسانی جانوں کی کیا اہمیت ہے؟ ہم ایک دوسرے کو کیوں قتل کرتے ہیں؟ پاکستان میں بھی ابھی تک کوئی آئین کوئی دستور کیوں نہیں بن پایا؟:

> یہاں پر آئے دن حکومتیں بدلتی رہتی ہیں۔ انڈیا میں ایک مضبوط جمہوریت کی جڑیں لگ چکی ہیں اور دیکھو انھوں نے ماؤنٹ بیٹن کو گورنر جنرل لگا کر کتنے فائدے اُٹھائے۔ اپنی بنیادیں مضبوط کر لیں۔ یہاں کسی کو سوجھتی ہی نہیں، اتنی دور کی۔[۲۴]

ناول میں مصنفہ کا سیاسی شعور بھی کارفرما نظر آتا ہے اور وہ ملک کی سیاسی ابتری کو ناسٹلجیا کی صورت میں بیان کرتی ہیں۔ تقسیم ہند کے دوران برپا ہونے والے فسادات اور قتل و غارت کے واقعات اور قیام پاکستان کے بعد سماجی و معاشی حالات اور ۱۹۷۱ کے سقوطِ ڈھاکہ کا نقشہ جن الفاظ میں کھینچا وہ پڑھتے ہوئے ناسٹلجیائی کیفیت کا احساس ہوتا ہے۔ بقول خالدہ حسین:

> اپنا ٹی وی مت دیکھو جس میں جنگ ایک ڈرامہ ہے۔ پوری زندگی ایک ڈرامہ ہے۔ اندرا گاندھی بچوں کو بم چاول کھانے کا مشورہ دے رہی ہے۔ باہر کے ٹی وی دیکھو جس میں نفرت اور خون کی راس رچائی جا رہی ہے..... پورا مشرقی پاکستان سر بریدہ لاشوں کا میدان..... ایک کٹھور، خشک، باریک اور سرد آواز نے سقوط ڈھاکہ کا اعلان کرتے ہوئے کہا ہماری سینا ڈھاکہ میں داخل ہو گئی۔[۲۵]

خالدہ حسین کا یہ ناول سیاسی، سماجی اور معاشی حالات کی ابتری کو ظاہر کرتا ہے جس میں انھوں نے اپنے موجودہ عہد سیاسی و سماجی حالات اور سیاسی حالات کو اس طرح بیان کیا ہے کہ تمام واقعات ایک ناسٹلجیائی پیرائے میں ڈھل جاتے ہیں۔ خالدہ حسین اپنے اس ناول میں مارشل لاء آمریتی دور کی عکاسی کرتی ہیں اور جنرل ایوب خان کے حوالے سے وہ ناول میں ایک جگہ لکھتی ہیں:

> ایوب خان کی وجاہت نے سب کے دلوں میں جھنڈے گاڑ دیے تھے۔ یہ فوجی تھا یہ تو کبھی خیال ہی نہ آتا۔ مارشل لاء ایک آزاد قوم کے لیے باعثِ ندامت ہے۔ اس کا انھیں کب ہوش تھا۔[۲۶]

یہاں یہ اقتباس شعور و آگہی سے لاعلمی کے حوالے سے تعلق رکھتا ہے۔ جب انسان کو حقیقت کا علم نہیں ہوتا اور وہ اپنے پوائنٹ آف ویو کے مطابق کسی بھی چیز، واقعے یا انسان کے لیے رائے قائم کر لیتا ہے۔ یہ اس کی کم علمی یا کم

فہمی کی دلیل ہے جس طرح اقتباس میں مصنفہ نے ایوب خان کی وجاہت سے متعلق بیان کیا ہے کہ کس طرح مونا اور اس کی سہیلیاں اس کی وجاہت اور حسن سے متاثر نظر آتی ہیں مگر انھوں نے یہ تو کبھی سوچا نہ تھا کہ وہ ایک فوجی آمر تھا اور ایک آزاد قوم کے لیے یہ بات باعث ندامت سمجھی جاتی تھی کہ اس کے لیے مارشل لاء نافذ کیا جائے۔ یہ خیال ایک ایسے ذہن میں آتا ہے جس کا شعور آگہی کی ابتدائی منازل طے کر رہا ہے۔

مونا کے کردار میں ناسٹلجیا کی ایک صورت یہ بھی نظر آتی ہے کہ وہ احساسِ محرومی کا شکار ہے۔ یہ محرومی اس کو اپنے گھر کے ماحول کی وجہ سے لاحق ہوتی ہے ایک خاص خاندانی نظام کے تحت، روایتی اصولوں کی پابند مونا میں تنہائی، احساسِ کمتری اور مایوسی کی کیفیات پائی جاتی ہیں۔ وہ کبھی بھی کوئی فیصلہ آزادی سے کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ بزدلی اس کی فطرت میں شامل ہے۔ اس کی ذہنی صلاحیتیں اس کے والدین خصوصی طور پر اس کے ابا سے اجازت کی محتاج ہیں:

> یہ کیا تم نے مفت کا مسئلہ کھڑا کر دیا ہے۔ یہ لکھنا وکھنا تو بس لگتا ہے ایک وقتی اُبال ہے اور میں ہر گز کوئی لکھاری نہیں ہوں اور تمھیں معلوم ہے ہمارے گھر میں ادب کا بے حد چرچا ہونے کے باوجود ادیبوں شاعروں سے بدکنے کا ایک خاص ماحول ہے۔[۲۷]

زندگی کتنی نایاب چیز ہے مگر اس کی قدر و قیمت اس طرح نہیں کی جاتی جس طرح اس کا حق ہے اور یہ ایک دائمی حقیقت ہے کہ زندگی ایک نعمت ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی قدر کی جائے۔ اس کا احساس مونا کو اس وقت ہوتا ہے جب اس کی زندگی کو ایک فضول شے سمجھ کے استعمال کیا جا رہا ہوتا ہے۔ طرح طرح کے وہم اور وسوسے اس کو آ گھیرتے ہیں کہ ہم سب کی سوچ صرف ایک شادی پر ہی آ کر کیوں رکتی ہے۔ کیا صرف یہی ایک مرحلہ باقی ہے۔ کیا یہ کوئی بند گلی ہے جس سے باہر نہیں نکلا جا سکتا یا یہ کہ زندگی جو تبدیلی چاہتی ہے ہم اسے کچھ سمجھ نہیں پاتے:

> اس روز اسے واقعی شدید گھٹن کا احساس ہوا۔ وہ بکاؤ ریوڑ میں ایک چوپایہ، ایک ناقابل برداشت وقت کا پھیلاؤ سامنے پڑا تھا۔ زندگی جو اتنی نایاب ہے ایک جنس میں ڈھال دی جاتی ہے، صرف ہم ہی نہیں۔ اس نے دیکھا ہر سطح پر زندگی کی یوں ہی تذلیل ہو رہی ہے۔[۲۸]

خالدہ حسین کے ناول کاغذی گھاٹ میں پروسٹن ناسٹلجیا کی بھی عکاسی کی گئی ہے جس میں واقعات آتے ہیں اور ایک تسلسل کے ساتھ چلتے چلتے خود ہی منظر سے غائب ہو جاتے ہیں۔ ان واقعات کا تعلق ماضی کے کسی خاص جذباتی تجربے سے ہوتا ہے۔ ایسے ہی بہت سے جذباتی تجربے یا واقعات و سانحات مصنفہ کی تحریروں میں بھی در آتے ہیں۔ کبھی کبھی ان واقعات کا دورانیہ اچھا خاصا طویل ہو جاتا ہے اور مصنفہ کی ذات پر ایک خاص نقش چھوڑ جاتا ہے:

جاتی اکتوبر کی شام بہت جلد جھک آنے والا اندھیرا، کھڑکی سے نظر آنے والے خاموش اونچے درخت،، یوکلپٹس کس طرح دیکھتے ہی دیکھتے چاندی ایسے سفید، بلند و بالا نکل آئے تھے۔ ان کے نیچے پھیلا گھنی نرم سرسبز گھاس کا لان جس کے عین وسط میں فوارہ مدھم نغمگی کے ساتھ چل رہا تھا۔ پانی کا آبشار موتی کی لڑیوں میں ڈھل کر چھتری نما پھیلاؤ کے ساتھ ماربل کے بنے چھوٹے سے حوض میں اطراف کو بھگو رہا تھا۔ لونڈر کے کسی گھر سے اڑتی پکوان کی خوشبو مل کر ایک ہو گئی تھی۔ آسمان پر ایک بھولا بھٹکا پرندہ اپنی ڈار سے بچھڑ کے ادھر ادھر بھٹکتا پھرتا گھر کا راستہ بھول چکا تھا۔ (بڑی اماں حقہ کی نے منہ میں لیے کہہ رہی تھیں، ٹالی میرے بچھڑے لک ٹنوں ٹنوں) جبکہ اماں صوفے میں نیم دراز تھیں۔ ان کا چہرہ کل سے بھی زیادہ زرد تھا۔ معلوم نہیں کیوں اسے ایک دم محسوس ہوا، اماں نہیں رہیں گی۔ اماں ختم ہو جائیں گی۔ بہت جلد۔ پھر یہ منظر کبھی نہیں آئے گا۔ وہ یوں کھڑکی میں کھڑی نہ ہو گی نہ ہی اماں سامنے ہوں گی۔ اس کا دل ایک آہنی پنجے میں دبوچا گیا۔[۲۹]

مصنفہ نے ناول میں معاشرے کی منافقتوں کو بے نقاب کرنے کی عمدہ مثالیں پیش کی ہیں۔ خالدہ حسین کے ناول میں ناسٹلجیا کی بازگشت سنائی دیتی ہے اور ماضی کا انسان مربوط شناخت کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ ان کی تحریروں سے ماضی کی روایات سے ایک خاص قسم کی انسیت کا تاثر ابھرتا ہے جبکہ موجودہ زمانے کی سماجی اقدار اور ان سے وابستہ رویوں میں شدید گھٹن کا احساس ہوتا ہے۔ مادہ پرستی کے اس دور میں رہتے ہوئے وہ ماضی کی طرف مراجعت اختیار کرتی ہیں کیونکہ اس دور میں انھیں منافقت، خود غرضی اور حوس جیسی خرافات سے خاص طور پر نفرت ہے جب کہ ماضی میں یہ تمام چیزیں اس طرح عام نہیں تھیں صحبتیں خالص تھیں۔ اس کے برعکس آج کل منافقت ہی منافقت نظر آتی ہے:

اسی وقت ایک لمبی سی گاڑی پورچ میں آن رُکی۔ ایک بے ہودہ گستاخ ہارن گونجتا اور گونجتا رہا۔ ابا ہارن کو گستاخ اور بد تمیزی کی انتہا سمجھتے تھے۔ اور خاندانی نجابت کا ایک پیمانہ بھی کہ بھلے پیٹ بھرے لوگ کبھی گھروں میں آ کر ہارن نہیں دیتے۔ کاش اس وقت وہ وہاں موجود ہوتے۔ وہ سرکاری دورے پر ملتان گئے تھے۔[۳۰]

مندرجہ بالا اقتباس ہمارے معاشرے کی منافقتوں، مادہ پرستی، لالچ اور شو بازی کو ظاہر کرتا ہے جو آج کل کے دور میں عام ہے۔ لوگ بے مقصد زندگی کی دوڑ میں لگے ہوئے ہیں اور معاشرے کی ان خرافات نے لوگوں کو اذیت میں مبتلا کر دیا ہے:

زخمی فوجیوں کے لیے تحائف کے پیکٹ بنا کر بھیجے جا رہے تھے۔ اس نے اپنی بہت سی کتابوں کے پیکٹ بنا کر بھجوائے۔ یہاں تک کہ تکیہ برابر، طلسم ہوش ربا بھی جس پر اس نے موٹے حروف سے لکھا تھا۔

یہ کتاب مونا کی ہے۔ یہ تو اسے بعد میں خیال آیا کہ اسے پڑھے گا کون۔ مگر تب سوچ اور منطق کہیں منہ چھپائے بیٹھی تھی۔[۳۱]

مندرجہ بالا اقتباس ۱۹۷۱ کی جنگ کی صورت حال کا بیان ہے جس میں لوگوں کے جذبات کی عکاسی کی گئی ہے کہ کس طرح فوجیوں کے لیے تحائف بھجوائے جارہے تھے جس میں مونا نے بھی تحفے کے طور پر کتابوں کے پیکٹ بنا کر بھجوائے جن کا ایک اچھا خاص بنڈل تیار ہوا۔ مگر اسے بعد میں یہ خیال آیا کہ انھیں پڑھے گا کون۔ وہ اپنے آپ سے ہی مخاطب ہونے لگتی ہے کہ اس کی سوچ اور منطق کہیں منہ چھپائے بیٹھی تھی جب اس نے ایسا تحفہ تیار کرنے کے متعلق سوچا۔

ناول میں ایسے واقعات کی بھرمار نظر آتی ہے جن میں کرداروں کا شعور آگہی کے نچلے درجوں پر گامزن ہے۔ اس کی عمدہ مثال مونا کے کردار میں واضح ہے:

> خوف زدہ لوگوں کے اندر ایک غیر معمولی شجاعت پنپ سکتی ہے۔ ویسے مجھے اپنے خوف کی قطعاً کوئی پرواہ نہیں، اس نے شاید اپنے آپ سے کہا۔ یہ درست ہے کہ بہت سی چیزوں سے خوف زدہ رہتی ہوں مثلاً حادثے۔ جو لگتا ہے کہ ہر دم میرے تعاقب میں ہیں اور اپنے پیاروں کی موت اور اونچی آوازیں۔ مگر میں اس خوف کو بہت آرام سے نمٹا سکتی ہوں بغیر کسی کی مدد کے۔
>
> "وہ کیسے؟ خوفزدہ آدمی تو کچھ بھی نہیں کر سکتا"۔
>
> "میں اپنے آپ سے علیحدہ ہو جاتی ہوں"[۳۲]

ناول کی مرکزی کردار مونا کی یہ کیفیت جو اقتباس میں بیان کی گئی ہے دراصل اس کے اندر کے انسان کی کیفیات ہیں جو اپنے آپ میں تنہا ہے جس کی ذات میں اُداسی ہے، اتھاہ اُداسی اور دکھ اور کرب کی وہ شکل ہے جو اُسے اپنے پیاروں کی یاد دلاتی ہے۔ اپنے پیاروں کی موت اور ان سے بچھڑ جانے کا غم اور یہ غم شاید صرف اس اکیلی کا نہیں ہے بلکہ یہ غم تو ہر کسی کا غم ہے جن کے پیارے ان سے بچھڑ گئے ہوں وہ ایسی ہی کیفیت سے دوچار نظر آتے ہیں جس میں ناسٹلجیا ہے۔ ایک نہ ختم ہونے والا ناسٹلجیا اس کے وجود میں سمٹ آتا ہے:

> بولتے بولتے اسے اپنے وزن کے ختم ہونے کا احساس ہوا جیسے وہ کاغذ بن کر ہوا میں اُڑ جائے گی۔ اس کے ماتھے پر پسینہ آگیا۔ "تم بیٹھ جاؤ"۔ اس نے قریبی اسٹول کی طرف اشارہ کیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے دیکھا حسن کا چہرہ بے حد اُداس اور پریشان تھا۔[۳۳]

مونا کے کردار میں جو ایک اور ناسٹلجیائی کیفیت سامنے آتی ہے وہ اس کی خواہش کا پورا نہ ہونا ہے اور وہ اس کی تخلیقی صلاحیتوں کا استعمال نہ ہونا ہے۔ یہ ایک ایسی کمزوری، ایسی محرومی ہے کہ جس نے اسے کش مکش اور دوہری

اذیت میں مبتلا کر رکھا ہے حسن اس کی زندگی میں یہ کردار ادا کرتا ہے کہ اسے ایک اچھی لکھاری بننے پر آمادہ کرتا ہے وہ چاہتا ہے کہ وہ اپنے اندر کے زہر کو اُگل دے۔ یہ ہی تخلیقات کا سرچشمہ ہے مگر وہ بیک وقت دو دنیاؤں میں سانس لے رہی تھی۔ ایک وہ دنیا جس کا اس کی موروثیت سے کوئی واسطہ نہیں کیونکہ وہ اس کے روایتی خاندانی نظام کے خلاف ہے اور ایک وہ جسے وہ خود ساختہ طور پر اختیار کرنا تو چاہتی ہے مگر اس کا خاندانی نظام اس کے آگے ایک واضح دیوار بنا کھڑا ہے:

> ایک نئی دنیا اس کے سامنے کھلی تھی جو اسے بتاتی تھی کہ اس کے تخیل اور احساس کی ہر واردات سچ اور قابل توجہ ہے۔ اس میں کوئی جھوٹ اور واہمہ نہیں۔ مگر اس کی مشکل یہ تھی کہ وہ اپنی موروثی دنیا کو خیر باد کہہ کر پوری اس نئی دنیا میں داخل نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ بیک وقت دو دنیاؤں میں سانس لے رہی تھی۔ اور سب کچھ ٹوٹ پھوٹ رہا تھا۔ اسے اپنے ہاں کے بڑے بڑے لکھنے والوں کو دیکھ کر رشک آتا۔[۳۴]

خالدہ حسین کے ہاں ماضی کی رعنائیاں اور دلفریب یادیں ان کے لیے راحت کا سبب بنتی ہیں۔ وہ ماضی کی رفاقتوں کو یاد کرتی ہیں تو کبھی راحت اور کبھی اداسی کا شکار نظر آتی ہیں کیونکہ ماضی خوشی اور غم کا مجسمہ ہے۔ اسی طرح خالدہ حسین کے ناول کاغذ گھاٹ میں بھی خوشی و غم کی ملتی جلتی کیفیات دیکھی اور محسوس کی جاتی ہیں۔ مونا جب ماضی کے گزرے لمحات کو یاد کرتی ہے تو اسے اپنی ماں یاد آتی ہے اور ماں کے ساتھ گزارا ہوا ایک ایک لمحہ اُس کے ذہن میں اُتر آتا ہے کہ اس نے ماں کے ساتھ کیسا وقت گزارا اور اُس کی ماں کس طرح اس کا خیال رکھا کرتی تھیں وہ اسے کتنے لاڈ دیتیں اور ناز نخرے اُٹھایا کرتیں اور اُن کی زندگی کے آخری ایام جب وہ بسترِ مرگ پر تھیں تو کس طرح مونا کے لیے فکر مند ہو جایا کرتیں۔ ان کا بخار کی تپش سے آنکھیں موند لینا اور نیم مدھم آواز میں اپنے گزرے پل اور نانا ابا کی باتوں کو یاد کرنا، وہ دیر تک اپنی یادوں کے دفینے کھولتی رہیں اور مونا نے اپنی ماں کی گھانٹوں بھرے محنتی ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں سہلایا۔ وہ نقاہت کے مارے خاموش ہو گئیں۔ ان تمام باتوں کو جب ناول کی واحد متکلم یاد کرتی ہے تو اسے ایک شدید کرب اور دکھ سے دوچار ہونا پڑتا ہے:

> وہ نقاہت کے مارے خاموش ہو گئیں تو اسے کمرے میں ٹک ٹک کرتی گھڑی سنائی دی۔ آج وہ لمحے لمحے کی خبر دے رہی تھی کہ میں گزر رہا ہوں، میں گزر رہا ہوں۔ پہلے تو وقت اتنی فصاحت سے تیزی سے نہیں گزرتا تھا۔ نہ ہی غروب کے وقت دیواروں کے اترے سائے ایسے پراسرار ہوتے تھے۔
>
> اماں کو اور ان کی اماں کو اور ان کی اماں کو۔ آج تک ہر عورت کو صرف ایک ہی گیت یاد تھا:
>
> "کنکاں لمیاں.....دھیاں کیوں کمیاں نی مائے"۔[۳۵]

مندرجہ بالا اقتباس کا آخری جملہ معنی خیز ہے۔ وقت ہمیشہ ایک جیسا نہیں رہتا۔ اس میں اُتار چڑھاؤ بھی آتے ہیں، خوشی و غم کی مدھم مدھم لہریں زندگی کا حصہ ہیں۔ اسی طرح حال ماضی میں بدل جاتے ہیں۔ یادیں ہی انسان کا سرمایہ ہوتی ہیں۔ زندگی کا تسلسل یوں ہی اپنی رفتار کے ساتھ قائم دائم ہے۔ بیٹیوں کا رشتہ بہت پیارا ہوتا ہے۔ یہ ایک زبان زدِ عام جملہ ہے مگر یہ ماں باپ کو ان کی جدائی کا غم ایک انجانے خوف اور دکھ میں مبتلا کر دیتا ہے کہ اگلے گھر (سسرال) میں اُن کے ساتھ کیسا سلوک ہوگا۔ ان کا مقدر کیسا ہوگا۔ یہ تحفظات قدرت کی طرف سے ایک نظام کے تحت چلے آرہے ہیں جو انسان کو ناسٹلجیک بنا دیتے ہیں جو زندگی بھر اُن کا ناسٹلجیا بن کر ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ لفظ بدل جاتے ہیں مگر احساس نہیں بدلتے۔ اُن کا مفہوم بھی وہی رہتا ہے۔ محض اُن کی جگہ کوئی اور لفظ تشکیل پا جاتے ہیں۔ عورت کا یہ ہی اصل ہجر و فراق اس کا دائمی ناسٹلجیا ہے:

> وہ دلہن بنی اس دنیا کی مخلوق نظر نہ آ رہی تھی۔ شروع سے لے کر آج تک اس کی تمام شبیہیں اس کی آنکھوں میں گھوم گئیں۔ وہ سوتی ڈھیلے پاجامے، گلابی کرتے میں ملبوس گول مٹول سرخ و سفید لڑکی ''لو کتارا کھاؤ'' وہ جو تاج محل اور قطب صاحب اور قلعہ معلیٰ کی سرزمین سے آئی تھیں، وہ جس نے اتنی تیزی سے ایک گلیمر بھری دنیا میں قدم رکھا تھا اور اب ایک انجانی مسافت پر رواں ہونے لگی تھی جھومر اس کے خوب صورت نرم و نازک ماتھے پر دمک رہا تھا اور باہر حسیب شدید احساس برتری کے ساتھ اپنے ضعیف بے حد مہذب اور کمزور سسر سے سلامی وصول کر رہا تھا۔[۳۶]

اس اقتباس میں بھی ماضی کی یادوں کا نیم کڑوا احساس جو مونا کے حواس پر سوار ہو جاتا ہے کہ وقت کتنی بے اعتبار شے ہے، اس کا کوئی بھروسہ نہیں۔ پل میں کہاں سے کہاں لے جاتا ہے۔ وقت کا یہ خاصا ہے کہ وہ کبھی ٹھہرتا نہیں۔ اس کی سیمابی طاقت اسے ہمیشہ منزل پر رواں دواں رکھتی ہے۔ مونا جب ماضی پر نگاہ ڈالتی ہے تو اسے بچپن کی وہ سہیلی جو آج شادی رچا رہی تھی، ایک معصوم بچی کی طرح کھڑی سکول میں نظر آتی ہے جب اُس نے پہلی بار مونا کو ''کتارا کھاؤ'' کی آفر کی تھی جب کہ آج جب وہ اُس کو دیکھتی ہے تو وہ دلہن کے روپ میں ہے۔

خالدہ حسین کی تحریروں میں ماضی ایک خوب صورت تاثر بن کر اُبھرتا ہے۔ یہ اُن کی شخصیت کا اہم پہلو ہے کہ وہ ماضی کی رفاقتوں کو بھلا نہیں سکتیں۔ اس لیے ان کو دائمی بنانے کی غرض سے اپنے حال کا حصہ بنائے رکھتی ہیں، ماضی کو یاد کرتے رہنا ان کا مرغوب مشغلہ ہے تاہم ان کے ناول **کاغذی گھاٹ** میں یہ عنصر غالب نظر آتا ہے:

> افروز بھی ایک کالج میں پڑھانے لگی تھی حالانکہ اُسے ریسرچ کے لیے اسکالرشپ بھی پیش کیا گیا تھا مگر وہ ایک دم نہایت سنگ ہو چکی تھی۔ اس کے نزدیک اب یہ پڑھائی، علم، جستجو اور شوق، سب بہت ہی بیکار چیزیں تھیں کیونکہ یہ انسان کو عملی زندگی اور اس کے مسائل سے بہت دور لے جاتی تھیں۔ یہ ایک طرح کا نشہ تھا۔ اسے اپنے اس بے حساب وقت کا انتہائی قلق تھا جو اس نے حصول علم میں ضائع کیا

،کیونکہ اس کے آس پاس کے ماحول میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی اور چاروں طرف غربت، استحصال
اور ناانصافی، بیماری اور ظلم و ستم کا وہی دور دورہ تھا۔[۳۷]

ناسٹلجیا کی ایک صورت خواہشات کا پورا نہ ہونا بھی ہے۔ یہ صورت ہمیں ناول میں افروز کے ہاں نظر آتی ہے۔ افروز ایک انقلابی ذہن رکھنے کے باوجود معاشرے کی بگڑتی صورت حال کے سامنے اپنے آپ کو بے بس ولاچار تصور کرتی ہے۔ حالات اس کی توقعات کے خلاف چلے جاتے ہیں۔ وہ بڑی بڑی تقریریں اور بلند و بانگ نعرے، وہ تمام دعوے جو وہ کیا کرتی تھی اور مونا کو اس کی بزدلی کے طعنے دیتی کہ وہ بے مقصد زندگی گزار رہی ہے۔ ایسی زندگی کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اس تمام صورت حال کی وجہ سے وہ ایک شدید صدمے سے دوچار ہو جاتی ہے۔ اس کی تمام امیدیں خاک ہو جاتی ہیں اور اس کی جستجو، شوق اور علم تمام بے کار لگنے لگتا ہے۔

خالدہ حسین کے ناول کاغذی گھاٹ میں یوں تو کئی حوالے، موضوعات اور رجحانات ملتے ہیں، تاہم ہماری تحقیق میں کاغذی گھاٹ کے اندر پائی جانے والی ناسٹلجیائی کیفیات کا جائزہ ہے تاہم اس میں ناسٹلجیا ایک غالب رجحان ہے جس کی کارفرمائیاں مصنفہ کی تحریر میں ایک طویل دورانیے کا ناسٹلجیا پیش کرتی ہیں۔ ناول کا دورانیہ تحریک پاکستان کے عروج کے زمانے سے لے کر ۱۹۶۵ تک یعنی تقریباً تیس برس پر محیط ہے۔ ناول کا کینوس اگرچہ زیادہ وسیع نہیں ہے لیکن اس کا فکری کینوس بہت بڑا ہے۔ ناول کے شروع میں مصنفہ کا شعور ایک کم فہم اور کم جاننے والی، حیرتوں میں ڈوبی مونا کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ اس کے بعد ایک نیا ماحول سامنے آتا ہے۔ اب وہ ایک لکھاری اور فلسفی کی صورت میں منظر عام پر آتی ہے اور مختلف اوقات میں سیاست، زندگی یا عورت سے متعلق مسائل پر بحث کرتی دکھائی دیتی ہے۔ زندگی اس پر نئے سرے سے آشکار ہوتی ہے اور وہ تمام لوگ جو اسے کبھی احساسِ کمتری میں مبتلا کیے رکھتے تھے اور اس کی نفسیاتی الجھنوں کا باعث بنتے تھے، ان کا منطقی انجام اُسے کرب میں مبتلا کر دیتا ہے۔ یوں ہر کردار کی کہانی کے اختتام کے ساتھ خود اس کی اپنی کہانی اس کی شادی پر ختم ہو جاتی ہے۔

خالدہ حسین نے اپنے ناول کاغذی گھاٹ میں انسانی زندگی کے بہت سے پہلوؤں کو گرفت میں لینے کی کوشش کی ہے۔ خالدہ حسین نے اس ناول میں موضوعات در موضوعات قلم بند کیے ہیں۔ اس وقت کے حالات جب ایک نوزائیدہ مملکت کا قیام عمل میں آیا۔ اس وقت کی سیاسی و ذہنی گھٹن، معاشی و سماجی حالات، سیاسی انتشار و افراتفری، تعصبات، قومی مسائل، تعلیمی اداروں کے مسائل، ہندو مسلم تضادات و اختلافات، مہاتما گاندھی کا قتل، قائداعظم کی شخصیت کے کارنامے، سرحدوں کا بٹ جانا، مہاجرین کی آمد، مارکسزم، طبقاتی تقسیم ۱۹۶۵ اور ۱۹۷۱ کی جنگ وغیرہ ان سب موضوعات کو خالدہ حسین نے ناول میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔

تاہم مجموعی طور پر، ان تمام موضوعات کے پیش نظر ایک اہم رجحان ناسٹلجیا ناول میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ ناول نے سماجی، سیاسی اور ثقافتی و تہذیبی تبدیلیوں، مٹتی ہوئی تہذیب کی نشانیاں، ہجرت کا کرب، طبقاتی تقسیم اور ہماری معاشرت میں پائی جانے والی منافقت اور خود غرضی اور مادیت پرستی کی جانب اشارے کیے ہیں۔ اس ناول پر بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر ممتاز احمد خان کا کہنا ہے کہ:

> ناول کا عنوان کاغذی گھاٹ علامتی حقیقت رکھتا ہے جہاں امیدوں کی کشتیاں کنارے لگتی ہیں مگر مایوسی و ناامیدی کی موجیں ان کو بہا کر لے جاتی ہیں اور کاغذی یا کاغذ گھاٹ اپنی بنیادوں پر کھڑا رکھنے کی تگ و دو کرتا رہتا ہے۔[۳۸]

اپنی دوسری کتاب "اردو ناول کے ہمہ گیر سروکار" میں ان کا کہنا ہے:

> یہ کاغذی گھاٹ کا عنوان کسی معنویت کا حامل ہے۔ ناول میں یہ سوال ابھرتا اور ڈوبتا رہتا ہے، کیا ہمارا معاشرہ کاغذی گھاٹ کی علامت سے متصف ہے۔ وہ کاغذی گھاٹ جہاں امیدوں کی کشتیاں کنارے نہیں لگتی اور ناامیدی اور المیوں کی موجیں ان کو بہا کر لے جاتی ہیں یا یہ استعارہ ہے۔ اس سماجی، سیاسی اور اخلاقی تباہی اور بربادی کا جو منافق معاشرے کا مقدر ہے۔ اس کی کئی تعبیریں ہو سکتی ہیں۔ مونا نے غم ذات اور غم کائنات دونوں کا اظہار کیا ہے اور اس کا داخلی کرب ہر قسم کی صورت حال میں نمایاں ہے، گویا تاریخ کے سفر میں انسانی ذات کے کرب ناک سفر کو کاغذی گھاٹ کی علامت سے واضح کیا گیا ہے۔[۳۹]

مجموعی طور پر اس ناول کے کردار ماضی کے ادوار سے نہ صرف جڑے ہوئے ہیں بلکہ اس کی پرستش میں بھی مبتلا ہیں۔ ان کے لیے ماضی ایک حسین خواب ہے جہاں زندگی اپنی پوری توانائیوں اور جولانیوں کے ساتھ رواں دواں ہے۔ اس دور میں کم فہمی اور کم آگہی بھی ایک نعمت تھی۔ لوگ کم پڑھے لکھے اور اشیاء کی حقیقتوں کی کھوج میں کم پڑتے تھے، اس لیے زندگی معیارات سے مبرا تھی۔ زندگی کے حسین لمحات سالوں مسرت اور روح کی توانائی کا وسیلہ بنے رہتے ہیں۔ یہی قوت اور توانائی اس ناول کے کرداروں کو ماضی کی طرف مراجعت پر مجبور کرتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ قرۃالعین حیدر، خصوصی مطالعہ مرتبہ سید عامر سہیل، ڈاکٹر علی اظہر (ملتان: بیکن بکس، ۲۰۰۳ء)، ص ۵۱۲۔

۲۔ خالدہ حسین، کاغذی گھاٹ (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء)، ص ۳۔

۳۔ ایضاً، ص ۳۶۔

۴۔ ایضاً، ص ۴۔

۵۔ ایضاً، ص ۳۳۔

۶۔ ایضاً، ص ۴۷۔

۷۔ ایضاً، ص ۵۳۔

۸۔ ایضاً، ص ۵۴۔

۹۔ ایضاً، ص ۳۷۔

۱۰۔ منشایاد، "خالدہ حسین کا فن" سہ ماہی ادبیات شمارہ ۶۶ (۲۰۰۴ء)، ص ۱۲۔

۱۱۔ ایضاً، ص ۴۲۔

۱۲۔ ایضاً، ص ۴۳۔

۱۳۔ ایضاً، ص ۳۶۔

۱۴۔ ایضاً، ص ۴۴۔

۱۵۔ ایضاً، ص ۲۷۔

۱۶۔ ایضاً، ص ۲۹۔

۱۷۔ ایضاً، ص ۴۶۔

۱۸۔ ایضاً، ص ۴۶۔

۱۹۔ ایضاً، ص ۲۷۔

۲۰۔ ایضاً، ص ۵۲۔

۲۱۔ ایضاً، ص ۶۴۔

۲۲۔ ایضاً۔ ص ۶۴۔

۲۳۔ ایضاً، ص ۱۲۔

۲۴۔ ایضاً، ص ۶۰۔

۲۵۔ ایضاً، ص ۹۵۔

۲۶۔ ایضاً، ص ۶۱۔

۲۷۔ ایضاً، ص ۶۸۔

۲۸۔ ایضاً، ص ۷۰۔

۲۹۔ ایضاً، ص ۷۱۔

۳۰۔ ایضاً، ص ۷۱۔

۳۱۔ ایضاً، ص ۷۵۔

۳۲۔ ایضاً، ص ۷۸۔

۳۳۔ ایضاً، ص ۷۹۔

۳۴۔ ایضاً، ص ۸۰۔

۳۵۔ ایضاً، ص ۸۴۔

۳۶۔ ایضاً، ص ۸۷۔

۳۷۔ ایضاً، ص ۹۰۔۹۱۔

۳۸۔ ممتاز احمد خان، آزادی کے بعد اردو ناول ہیئت، اسالیب اور رجحانات (کراچی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۹۷)، ص ۲۹۸۔

۳۹۔ ممتاز احمد خان، اردو ناول کے ہمہ گیر سروکار (لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۲)، ص ۲۷۔

باب پنجم:

ماحصل

ادب انسانی زندگی کا وہ نمائندہ حوالہ ہے جو بیک وقت ماضی، حال اور مستقبل تینوں کے احوال و مسائل کا احاطہ کرنے کی کوشش کرتا ہے اور انسانی معاشرے میں جنم لینے والے تمام رویوں، رجحانات، عوامل اور تحریکات کی نمائندگی اپنے خاص انداز میں کرتا ہے۔ اردو ادب کی تمام اصناف میں ناول کو اپنی وسعت، ہمہ گیری اور آفاقیت کی بنا پر اہم ترین مقام حاصل ہے۔ ناول اپنی وسعت کی وجہ سے زندگی کے تمام مسائل اور پہلوؤں کی عکاسی بہترین طور پر کر سکتا ہے۔ ہر بڑا ناول کائنات سے اپنا مرکزی خیال (تھیم) اور کردار اخذ کرتا ہے، حیات انسانی کے بے رنگ و بے کیف واقعات سے ہٹ کر خود اپنے طور ایک جہان معنی ہوتا ہے۔ کسی مختصر جائزے میں کثیر الجہات ناول کا جائزہ لینا ممکن نہیں ہوتا۔ ناول کو اس کی وسعت کی بنا پر اگر بقول ڈاکٹر خالد اشرف Mother of All Firms کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔

تقسیم پاکستان کے بعد ناول میں معاشرتی، معاشی اور تہذیبی تبدیلیوں کو موضوع بنایا گیا۔ ایسے میں ناول میں مختلف رجحانات نے جگہ پائی۔ ان میں سے ایک اہم رجحان "ناسٹلجیا" ہے۔ ناسٹلجیا کو عام طور پر ماضی کے شدید احساس سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ماضی میں ناسٹلجیا کو ایک بیماری قرار دیا جاتا رہا ہے، کیونکہ ماضی میں گھر سے دور رہنے والے سپاہی یا گھر واپس جانے کی شدید خواہش کے نتیجے میں دل شکستگی اور اُداسی کا شکار ہو جاتے تھے۔ گزرے پل اور جڑوں سے کٹ جانے کا نتیجہ ناسٹلجیا کی شکل میں نکلا۔

ناسٹلجیا سے مراد دماغی پسندی ہے۔ یہ اصطلاح نفسیاتی، ذہنی امراض میں مبتلا مریضوں کا علاج کرنے کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ یہ ایک ایسا مرض ہے جس میں مریض اپنے ماضی کی کرب ناک یادوں میں مبتلا ہو کر حال میں ماضی کو تلاش کرتا ہے۔ حال کی ناآسودگی سے تنگ آ کر ماضی کی طرف مراجعت کا سفر اختیار کر لینا اور انسان کا ماضی کی خوش گوار یا ناخوش گوار یادوں میں وقت گزارنا اور اس میں راحت محسوس کرنا، اس کیفیت کو ناسٹلجیا کا نام دیا جاتا ہے۔

ناسٹلجیا کی مختلف صورتیں ہیں جن میں یاد ماضی، وطن واپسی کی خواہش، داخلی خود کلام، جڑوں کی تلاش، تسلسل کی آرزو، احساسِ زیاں یا خوابوں میں زندہ رہنے کی خواہش وغیرہ شامل ہیں۔ ناسٹلجیا کو عمومی طور پر محض ہجرت کا سبب ہی گردانا جاتا ہے، کہ اس کی وجہ ہجرت کے بعد پیدا ہونے والی کیفیت ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں لیکن اس کے ساتھ اور بھی کئی عوامل اور محرکات ہیں جو کسی شخص کو ناسٹلجیا میں مبتلا کرنے کا باعث بنتے ہیں۔ مثلاً خواہشات

پوری نہ ہونا، توقعات کے خلاف واقعات کا وقوع پذیر ہونا، حساسیت، زود و رنج ہونا، بیرون ملک ملازمت یا حصولِ علم کے لیے جانا، دوستوں اور اپنے قریبی عزیزوں کا بچھڑ جانا وغیرہ۔

ہر ادیب اپنے مشاہدات اور تجربات کو اپنے ارد گرد کے ماحول سے حاصل کرتا ہے اور اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے ان تجربات کو ادب کا حصہ بناتا ہے اور اپنے رجحانات اور فطری میلانات کے مطابق خارجی دنیا سے اخذ کرتا ہے۔ اس اعتبار سے کوئی خاص رجحان ادبی تحریر بن کر سامنے آتا ہے۔

خالدہ حسین پاکستان کی معروف ادیبہ ہیں۔ ان کا تخلیقی سفر کم و بیش چھ دہائیوں پر محیط ہے۔ انھیں بنیادی طور پر وجودی فکشن مانا جاتا ہے۔ ان کی کہانیوں میں فردیت، موجودیت، شناخت، خوف، تنہائی، احساسِ جرم، انسان دوستی، نفسیاتی مسائل اور مابعد الطبیعاتی عناصر کو تلاش کیا جا چکا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے ناول میں ناسٹلجیائی رجحان کی پیش کش بھی نظر آتی ہے۔

انسان بنیادی طور پر اپنے ماضی سے جڑا ہوا ہے۔ اس کا تعلق ماضی سے کبھی ختم نہیں ہو سکتا کیونکہ ماضی اس کا اصل ہے، اس کی حقیقت ہے، ماضی نہ ہو تو حال بھی نہیں رہتا۔ یہ ایک سلسلہ ہے ماضی پہلے آتا ہے اور گزر جاتا ہے، اس کے بعد حال اور مستقبل۔ چنانچہ جب ہم ماضی کو یاد کرتے ہیں تو ایک نفسیاتی بیماری یا نفسیاتی رجحان ہمارے شعور میں داخل ہوتا ہے۔ وہ رجحان ناسٹلجیا ہے۔ ناسٹلجیا ایک اہم موضوع ہے۔ ہر فرد کی اندر ناسٹلجیا کسی نہ کسی شکل میں موجود ہوتا ہے۔ ہر دور ایک نئی تبدیلی کے ساتھ داخل ہوتا ہے جیسے جیسے وقت گزرتا ہے ماضی کا حصہ بنتا رہتا ہے۔ انسان کو یادیں دے جاتا ہے۔ یہ یادیں خوش گوار یا ناخوش گوار دونوں صورتوں میں انسان کے شعور اور لاشعور کا حصہ بنتی رہتی ہیں اور انسان کو حال میں رہتے ہوئے ماضی سے منسلک رکھتی ہیں۔

اردو ادب میں ناسٹلجیا کی موجودگی تقسیمِ ہند کے بعد واضح نظر آتی ہے۔ بقول قرۃ العین: اردو ادب جو تقسیم کے بعد لکھا گیا سارا کا سارا ناسٹلجیا کی پیداوار ہے اور بذاتِ خود ان کا اپنا سارا ادب بھی ناسٹلجیا سے جنم لیتا ہے کیونکہ یہ وہ وقت تھا، جب تقسیمِ ہند کے نتیجے میں عوام ارضی پیوستگی کے شدید احساس کے تحت بے زمینی، عدم تشخص اور عدم تحفظ اور بے جڑی کے مراحل سے گزرے تاہم قیام پاکستان کے نتیجے کے طور پر لوگ ناسٹلجیا کے شدید دور سے گزرے کیونکہ لوگوں کو اپنا گھر بار چھوڑ کر نئی سرزمین پر ہجرت کرنا پڑی اور ایسا کرنے میں وہ اپنی جڑوں سے کٹ گئے۔ اپنے ماضی سے بچھڑ گئے۔ یہ ہی وجہ ہے کہ نئے ماحول میں آنے پر انھیں اپنے گھر بار شدت سے یاد آتے ہیں اور بعض اوقات یہ شدت ناسٹلجیا کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس اعتبار سے قیام پاکستان کے بعد جتنا بھی ادب تخلیق ہوا اس میں ناسٹلجیا کا در آنا ایک فطری عمل تھا۔

ادیب ہمارے معاشرے کے حساس فرد ہوتے ہیں۔ وہ اپنی قوتِ متخیلہ اور تجربات کو ادب کا حصہ بناتے ہیں۔اس اعتبار سے موضوع کی اہمیت کو مد نظر رکھتے ہوئے مقالے کی بنیاد درج ذیل سوالات پر رکھی گئی ہے:

۱۔ خالدہ حسین کے ناول میں ناسٹلجیائی رجحان کو کس انداز میں پیش کیا گیا ہے؟

۲۔ ناول میں کرداروں اور واقعات کے ذریعے ناسٹلجیا کی عکاسی کیسے کی گئی ہے؟

۳۔ مصنفہ کا تاریخ اور سماجی شعور کیسے ناسٹلجیا کے سانچے میں ڈھلتا ہے؟

ان سوالات کی بنیاد پر یہ مقالہ لکھا گیا۔ مقالہ لکھتے وقت حتی الامکان اس بات کی کوشش کی گئی کہ تمام سوالوں کے جوابات ڈھونڈے جا سکیں۔ ناسٹلجیا کو بیان کرتے ہوئے پس منظر کا جائزہ لینا ضروری تھا اس لیے پہلے باب میں ناسٹلجیا کو بیان کیا گیا ہے۔ ناسٹلجیا کی مختلف تعریفیں، ان کی اہم شکلیں و صورتیں اور ان کے بنیادی مباحث و نظریات پر بات کی گئی ہے اور ساتھ ہی قیامِ پاکستان کے بعد ادبی صورتِ حال کو مد نظر رکھتے ہوئے ناول میں در آنے والے مختلف رجحانات کو بھی بیان کیا گیا ہے جن میں تہذیبی رجحان، سیاسی رجحان، رومانوی رجحان، حقیقت پسندانہ رجحان، جنسی اور نفسیاتی رجحان، آدرشی رجحان، فکاہیہ رجحان، دستاویزی رجحان، خود سوانحی رجحان اور ناسٹلجیائی رجحان وغیرہ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ناسٹلجیائی رجحان کی ادب میں ابتدا کیسے ہوئی اور کن کن اصنافِ ادب میں اس کے حوالے دیکھے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ یہ ایک تعارفی باب ہے، جس میں ناسٹلجیا کے متعلق معلومات فراہم کی گئی ہیں اور ناول کی روایت میں پیدا ہونے والے مختلف رجحانات کا مختصراً جائزہ لیا گیا ہے اور حتی الوسع کوشش کی گئی ہے کہ مقالے کے مقاصد کو مد نظر رکھا جائے۔

ناول جیسی کثیر الجہات صنف کو ایک مختصر مقالے میں بیان کرنا اچھا خاصا جان لیوا مرحلہ ہے تاہم ناول کے ارتقا کو ملحوظِ خاطر نہیں رکھا گیا بلکہ تقسیم کے بعد مختلف رجحان اور ان پر لکھنے والے ادیبوں کا ذکر کیا گیا ہے، خصوصی طور پر اہم رجحان ناسٹلجیا ہے۔

قیامِ پاکستان کے بعد جن لوگوں کے ہاں ناسٹلجیا ملتا ہے اُن میں نمایاں طور پر انتظار حسین اور قرۃ العین حیدر کا ذکر آتا ہے۔ یہ دونوں ایسے ادیب ہیں جو خود بھی ہجرت کر کے پاکستان آئے۔ قرۃ العین حیدر تو زیادہ عرصہ یہاں نہ رہ سکیں اور ہجرت کر کے واپس ہندوستان چلی گئیں۔ اس کے علاوہ عبداللہ حسین، کیفی اعظمی، فہیم اعظمی، شوکت صدیقی، الطاف فاطمہ، طارق محمود، صدیق سالک، بانو قدسیہ وغیرہ اہم ہیں۔ ناسٹلجیا صرف ناول تک ہی محدود نہیں بلکہ بڑے بڑے افسانہ نگاروں کے ہاں ناسٹلجیائی رجحان ملتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ شعر و ادب، ڈراموں اور فلموں میں بھی ملتا ہے۔

مقالے کے دوسرے باب میں "نمایاں ناول نگاروں کے ہاں ناسٹلجیا" کا جائزہ لینے سے پہلے ناول کے فکری محرکات کا جائزہ لیناضروری سمجھا گیاتا کہ اس کے نتیجے میں ناول نگاروں کے تاریخی و سماجی شعور کو جانچا جاسکے تاہم ناول کے فکری عناصر پر مختصراً بات کی گئی ہے جس میں عصری صورتِ حال کی تلخی، ہجرت لاشعور کی کارفرمائیاں، مسرت و سکون کی تلاش، تشخص کی تلاش، سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی ورثے سے دوری، انسانی رشتوں کے انہدام، قیام پاکستان کے بعد کے سیاسی حالات، بے یقینی، لاتعلقی اور بے جڑ ہونے کے اسباب شامل ہیں۔

اگر ہم قیام پاکستان کے بعد کی تاریخ دیکھیں، تو ہمیں تقریباً ہر ناول میں ناسٹلجیا کسی نہ کسی صورت میں دکھائی دیتا ہے اور بقول قرۃ العین حیدر اردو کا سارا ادب ہی ناسٹلجیائی پیداوار ہے۔ اس سلسلے میں چند ناول خاص طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ ایسے میں عزیز احمد کا ناول ایسی بلندی ایسی پستی ہے۔ اس ناول میں عزیز احمد نے جاگیرداری نظام کے زوال اور اس سے پیدا ہونے والی معاشرتی و تہذیبی تبدیلیوں کو موضوع بنایا ہے۔ ایسی بلندی ایسی پستی اس لحاظ سے بھی قابل ذکر ہے کہ اس میں عزیز احمد نے حیدر آباد دکن کی مٹتی ہوئی تہذیب کی عکاسی کی ہے۔ اس ناول میں فنی و فکری اور جمالیاتی لحاظ سے حسن نظر آتا ہے۔ ان کے ہاں ناسٹلجیا مٹتی ہوئی تہذیب کے پس منظر میں جگہ پاتا ہے۔

قرۃ العین حیدر کا ناول آگ کا دریا اڑھائی ہزار برس کی تاریخ ہے۔ ناول کا کینوس بے حد وسیع ہے۔ اس ناول کو کثیر الجہتی ناولوں میں شمار کیا جاتا ہے کیونکہ اس کے متعدد موضوعات ہیں تاہم ناسٹلجیا بھی اس ناول میں نمایاں نظر آتا ہے۔

عبداللہ حسین کا ناول اُداس نسلیں ایک شاہکار ناول ہے جس میں سیاست کی پیدا کردہ تقسیم کے نتیجے میں ہونے والی انسانی تباہی اور بے بسی کو پیش کیا گیا ہے۔ انھوں نے تحریکِ آزادی کے مختلف ادوار کے پس منظر میں یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ یہ سماجی اُتھل پتھل اور انتشار کے دور میں سب سے زیادہ نقصان کمزور اور بچھڑے ہوئے طبقے کو پہنچتا ہے۔ اس ناول میں بھی تقسیمِ ہند کے بعد ہجرت اور اس سے پیدا ہونے والے ناسٹلجیا کو بیان کیا گیا ہے۔

خدیجہ مستور کے ناول "آنگن" کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ اس ناول کا ذکر خدیجہ مستور کا حوالہ بن جاتا ہے اور ان کی پہچان بھی۔ اس ناول کو بہت سے نقادوں نے خوب سراہا ہے۔ اس ناول کی کہانی قیامِ پاکستان سے کچھ عرصہ پہلے سے شروع ہو کر قیامِ پاکستان کے بعد تک پھیلی ہوئی ہے۔ زبردست کردار نگاری، قصہ گوئی اور اسلوب بیان اس ناول کو شاہکار ناول بنا دیتے ہیں۔ ہجرت کے بعد پاکستان آمد ان کے ہاں ناسٹلجیا کا باعث بنتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اکثر کردار ماضی میں کھوئے نظر آتے ہیں۔

اس کے بعد انتظار حسین کا ناول۔"نیا گھر (تذکرہ)" ناسٹلجیائی رجحان کی عمدہ مثال ہے۔اس ناول میں ہیرو اخلاق کی والدہ کے ناسٹلجیائی کیفیات کے ساتھ ساتھ اپنا مکان بن کر مقامی جڑوں سے اتصال کی کہانی ہے۔اس ناول میں ان تمام مسائل کا تذکرہ ہے جو یہاں پر بسنے والوں کو پیش آئے۔اس ناول میں بھی پرانی یادیں سرمایہ ہیں اور ان یادوں سے پیچھا چھڑانا ناول کے کرداروں کے لیے ناممکن ہے۔

۱۹۷۹ء میں ادب کے منظر پر پیش آنے والا ناول بستی انتظار حسین کا شاہکار ہے۔ناول کی ہیرو صابرہ بدستور دلّی میں مقیم ہے۔اس نے اس پیمانِ وفا کو نبھایا ہے جو ذاکر نے اس سے کیا تھا کہ دلّی میں زندگی گزاریں گے۔وہ ہندوستان میں ہی رہ جاتی ہے لیکن ہجرت کر کے آنے والوں کو یہاں بھی پناہ نہیں ملتی۔انتظار حسین کو کچھ نقاد ہدفِ تنقید بناتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہجرت، ناسٹلجیا، جڑوں کی تلاش اور ماضی پرستی ان کا خاصہ ہے۔یہ نقاد ماضی پرستی کو "نفسیاتی بیماری" قرار دیتے ہیں۔بستی میں بھی یہی ماضی پرستی "ناسٹلجیا" کا سبب بنتی ہے۔

خالدہ حسین کا ناول کاغذی گھاٹ ناسٹلجیائی رجحان کے حوالے سے اہم ناول ہے۔اس ناول میں ہیرئن مونا کے حوالے سے پرانے ماحول کی یادنگاری اور ناسٹلجیائی کیفیات قاری کی سوچ کے لیے اہم ہیں۔ناسٹلجیا اس ناول کا غالب رجحان ہے۔اس ناول میں ہماری معاشرت میں منافقت، خود غرضی اور مادیت پرستی کی جانب اشارے کیے گئے ہیں۔مونا سنجیدہ ذہن کی مالک ہے اور اس کے سامنے پاکستان کے تمام سیاسی، معاشرتی اور معاشی بحران ہیں اور یہ تمام واقعات اُسے سوچ میں مبتلا رکھتے ہیں۔

اس مقالے کے تیسرے باب میں "خالدہ حسین کے ناول کاغذی گھاٹ کا (وقت کے تقابل/موجودہ صورت حال کی بدحالی) کے تناظر میں" کے عنوان سے تحقیق کی گئی ہے اور حتی الوسع تحقیقی معیار کو پورا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔اس باب میں کاغذی گھاٹ کا ماضی اور حال کے تہذیبی رویوں اور سیاسی و سماجی صورت حال کو تقابلی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔اس باب میں موجودہ صورت حال کی بدحالی اور ماضی کی طرف مراجعت کرنے کا بیان ہے۔انسانی فطرت ہے کہ وہ ہر چیز اور ہر صورتِ حال میں دوہرے رویوں سے دوچار رہتا ہے۔یہ رویے اس کی سوچ اور فکر میں تقابلی صورتِ حال کو جنم دیتے ہیں۔اس لیے وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اپنی موجودہ حیثیت اور قدروں کو کسی اور دور کے معیارات کے ساتھ تقابل کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ناول کی مصنفہ خالدہ حسین بھی ماضی پرستی کا شکار ہیں تاہم وہ حال میں سانس لینے کے باوجود ماضی کے اوراق میں پناہ گزیں نظر آتی ہیں اور ہر لمحہ اپنے آج کا تقابل گزرے کل کے ساتھ کرتی ہیں۔خالدہ حسین کے ناول میں ماضی زندہ و جاوید نظر آتا ہے۔ان کے لیے گزرا ہوا کل اور اس میں بسنے والے لوگ ایک خوشگوار تاثر بن کر سامنے آتے ہیں۔

مقالے کا چوتھا باب "(شعور و آگہی سے لاعلمی کا دور/پروسٹن ناسٹلجیا) کے تناظر میں مطالعہ" کے عنوان سے ہے جس میں کاغذی گھاٹ کو دو نکات کی مدد سے ناسٹلجیائی پیرائے میں بیان کیا گیا ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ ان دو نکات کو واضح الفاظ میں ناول سے اخذ کر کے اصلی حقائق پیش کیے جائیں تاہم شعور و آگہی سے لاعلمی کا دور وہ زمانہ یاد رہے جب انسان ترقی وار تقا کی ابتدائی منازل پر گامزن ہوتا ہے۔ خالق کائنات نے بنی نوع انسان کو پیدائش سے لے کر موت تک ایک مسلسل تبدیلی اور سیکھنے کے عمل سے مربوط کیا ہے۔ اب یہ انسان کی صوابدید پر منحصر ہے کہ وہ اس سیکھنے کے عمل کو مثبت طور پر اپناتا ہے یا کہ منفی ہتھکنڈوں کے حوالے کر دیتا ہے۔ اس بحث سے قطع نظر اگر ہم انسانی زندگی کے ارتقائی عمل پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ بات بخوبی سمجھ آتی ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انسانی ذہن شعور و آگہی کی نت نئی منازل طے کرتا ہے۔ چنانچہ جب اس شعوری ترقی کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہم ناسٹلجیا کو ذہن میں لاتے ہیں تو یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ ناسٹلجیائی یادیں دراصل اس دور سے متعلق ہوتی ہیں جب انسان موجودہ آج سے لازمی طور پر کم باشعور اور خود آگاہ ہوتا ہے۔

عمومی طور پر دیکھا جائے تو شعور اور آگہی کا حصول ایک مثبت قدر ہے، تاہم دوسرے زاویے سے دیکھا جائے تو انسان جس قدر باشعور ہو گا اس قدر اس پر ذمہ داریوں کا بوجھ اور توقعات کی فہرست بھی طویل ہو گی۔ چنانچہ یہ دوسرا زاویہ انسان کو زیادہ حساس بنانے کے ساتھ ساتھ زیادہ مشکل میں بھی ڈال دیتا ہے اور وہ چھوٹے چھوٹے واقعات اور تبدیلیوں پر خود کو ذہنی طور پر مقید خیال کرتا ہے۔ ناول کی مرکزی کردار بھی موجودہ دور میں اسی کوفت اور بے چینی سے دوچار ہے۔ اس لیے اس کے کردار میں ماضی سے انسیت اور ماضی کی طرف مراجعت اختیار کرنا پائی جاتی ہے، تاہم اس شعور کے تحت خالدہ حسین کے ناول کاغذی گھاٹ کو تحقیقی عمل میں جانچا اور پرکھا گیا ہے۔ پروسٹن ناسٹلجیا سے مراد کوئی اچانک پیش آنے والا واقعہ سانحہ ہے جو ماضی کے کسی خاص تجربے کو سلسلہ وار طریقے سے سامنے لاتا ہے۔ اس طرح سلسلہ وار واقعات اچانک سے نمودار ہوتے ہیں اور فوری طور پر غائب ہو جاتے ہیں۔

خالدہ حسین کے ناول کاغذی گھاٹ میں پروسٹن ناسٹلجیا پایا جاتا ہے تاہم اس مقالے میں پروسٹن ناسٹلجیا کو ناول کے ہر باب میں تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ناول میں مصنفہ نے پروسٹن ناسٹلجیا کے شعور کی عکاسی کی ہے۔ خالدہ حسین کے اس ناول میں واقعات جس تسلسل کے ساتھ آتے اور اچانک نمودار ہو کر چلے جاتے ہیں، واقعات کا ایک انبار لگ جاتا ہے۔ ان واقعات کا اثر خصوصی طور پر مصنفہ کی ذات پر نظر آتا ہے۔ وہ جب کسی واقعے کو یاد کرتی ہیں، تو اس کے ساتھ کئی دوسرے واقعات ان کے شعور میں وارد ہونے لگتے ہیں، جن کا تعلق ان کی ذات اور

کسی جذباتی تجربے سے وابستہ ہوتا ہے۔ایسے بہت سے واقعات کی پیش کش ناول میں دیکھی اور محسوس کی گئی ہے، اور حتی الامکان ان واقعات کو پر وسٹن ناسٹلجیا کے تناظر میں بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

کتابیات

امینہ، بی بی۔خالدہ حسین: شخصیت اور فن۔اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۱۷ء۔

احمد، انوار۔اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ۔فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۱۰ء۔

احمد، عزیز۔ایسی بلندی ایسی پستی۔لاہور: مکتبہ جدید، ۱۹۴۷ء۔

اشرف، خالد۔برصغیر میں اردو ناول۔لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۰۵ء۔

انصاری، اسلوب احمد، ڈاکٹر۔اردو کے پندرہ ناول۔علی گڑھ: یونیورسل بک ہاؤس، ۲۰۰۴ء۔

بٹ، محمد عاصم۔عبداللہ حسین: شخصیت اور فن۔اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰۷ء۔

بریلوی، عبادت۔اردو ادب میں جدید رجحانات۔

جاوید، قاضی۔"ناسٹلجیا کے بارے میں چند باتیں" مشمولہ ماہ نو، اکتوبر ۱۹۸۰ء۔

حسین، انتظار۔آگے سمندر ہے۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۰ء۔

حسین، انتظار۔بستی۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۴ء۔

حسین، انتظار۔نیا گھر (تذکرہ)۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء۔

حسین، خالدہ۔کاغذی گھاٹ۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء۔

حسین، عبداللہ۔اداس نسلیں۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۶۲ء۔

حقی، شان الحق۔مترجم آکسفورڈ اردو ڈکشنری۔آکسفورڈ پریس یونیورسٹی، ۲۰۰۵ء۔

حیدر، قرۃ العین۔"خصوصی مطالعہ" مرتبہ سید عامر سہیل، ڈاکٹر علی اظہر۔ملتان: بیکن ہاؤس، ۲۰۱۳ء۔

حیدر، قرۃ العین۔سفینہ غم دل۔لاہور: مکتبہ جدید، ۱۹۴۹ء۔

خان، ممتاز احمد۔اردو ناول کے ہمہ گیر سروکار۔لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۲ء۔

خان، ممتاز احمد۔آزادی کے بعد اردو ناول۔کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۷۷ء۔

خان، ممتاز احمد "جدید اردو ناول" مشمولہ آج کا اردو ادب۔فیروز سنز لمیٹڈ، ۱۹۷۰ء۔

دہلوی، شاہد احمد۔"دلی سے لاہور" مشمولہ نصرت۔جولائی ۱۹۵۹ء۔

ڈاکٹر، محمد ذاکر۔آزادی کے بعد ہندوستان کا ادب۔نئی دہلی: مکتبہ جامع، ۱۹۸۱ء۔

راشد، ن۔م۔کلیات ن۔م۔راشد (ماورا)۔لاہور: ماورا پبلی کیشنز، س۔ن۔

راہی، اعجاز "پاکستان میں ناول" مشمولہ اظہار۔ ۱۹۴۹ء۔ اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۱۹۸۳ء۔
شیخ معین الدین، حاجی۔ "اللہ اللہ کر کے آزادی کی صبح طلوع ہوئی" مشمولہ نصرت۔ اگست ۱۹۹۰ء۔
صدیقی، شوکت۔ خدا کی بستی۔ کراچی: مکتبہ نیاراہی، ۱۹۶۲ء۔
عبدالرسول، صاحبزادہ۔ تاریخ پاکستان۔ لاہور اردو بازار، آکسفورڈ اینڈ کیمبرج پریس، س۔ن۔
فیض، احمد فیض۔ نسخہ ہائے وفا (نقشِ فریادی)۔ لاہور: مکتبہ کاروان، س۔ن۔
قریشی، بشیر اے۔ پریکٹیکل ڈکشنری۔ لاہور: کتابستان پبلشر، اردو بازار، ن۔ن۔
نیازی، منیر۔ کلیاتِ منیر۔ لاہور ماورا پبلشرز، ۱۹۸۶ء۔
نظامی، خواجہ حسن۔ سی پارہ دل۔ دہلی: درویش پریس، ۱۳۳۴ھ۔
ہاشمی، رفیع الدین۔ اصنافِ ادب۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء۔
یوسفی، مشتاق احمد۔ آب گم۔ کراچی: مکتبہ دانیال، ۲۰۰۵ء۔
یاد، منشا، "خالدہ حسین کا فن" مشمولہ سہ ماہی ادبیات، شمارہ ۶۶، ۲۰۰۴ء۔

N. Dviad B. Guarlinifan, Websters, New Word Dictionary of the American Language, David B. Guarlniform, the World Publishing Company, Newyork and Cleveland.

The Oxford Encyclopaedia Dictionary, Bay, Book in Association with Oxford University Press.

Websites:

www.allencounlyky.com/infofold.disease.html

www.merrian.webster.com/dictionary/nostalgia

www.allencounlyky.com/infofold.disease.html

International Islamic Univ.
CENTRAL LIBRARY ISLAMABAD